جُمادی الأولیٰ۔ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ
اپریل۔ جون ۲۰۱۱ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اس شمارے میں

حرفِ اوّل

دوروزہ محاضراتِ قرآنی	حافظ عاطف وحید	3

مضامین قرآن

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	5

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح	افادات حافظ احمد یارؒ	15

حکمتِ نبویؐ

حفظِ قرآن کی اہمیت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	26

دعوت و تحریک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا تصورِ خلافت	ڈاکٹر صہیب حسن	29

اجتہاد و تقلید

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور مسلک اعتدال	پروفیسر عبدالماجد/ڈاکٹر ایاز خان	48

فکرو نظر

شریعت اسلامی میں شراب نوشی کی سزا(۳)	حافظ نذیر احمد ہاشمی	57

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	حافظ محمد زبیر	74

فکر فردا

THE ESTABLISHMENT OF KHILAFAH	Sumaira Khalid	84

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

دو روزہ مُحاضراتِ قُرآنی

۱۹/اور ۲۰/ مارچ ۲۰۱۱ء کو قرآن آڈیٹوریم میں منعقد ہونے والے دو روزہ محاضراتِ قرآنی اگرچہ ''سالانہ'' کی اضافی صفت کے ساتھ موسوم ہیں' تاہم اس تحریک کے وابستگان جانتے ہیں کہ گزشتہ تقریباً ایک دہائی سے ان کا انعقاد ''سالانہ'' کی پابندی کے بغیر ہوتا رہا ہے۔ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے عالمِ فانی کو خیر باد کہنے کے بعد یہ مرکزی انجمن خدّام القرآن کے تحت منعقد ہونے والا پہلا بڑا اور اپنی نوعیت کا ایک منفرد اجتماع تھا۔ ان دو دنوں میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم اور دانشور حضرات نے اپنے اپنے انداز میں اس عظیم شخصیت اور بیدار مغز ملّی رہنما کو ان کی قرآنی' دینی اور ملّی خدمات پر نہایت شاندار انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا جس نے اپنی پوری حیاتِ مستعار مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے' ان کے قلوب و اذہان میں دین کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرنے اور دین کے حکم و اقامت کے حوالے سے علمی' نظری اور عملی گوشوں کی توضیح اور اس عظیم مشن کے لیے ایک منظم جِدّوجہد برپا کرنے میں صرف کر دی۔

اس تقریب سے خطاب کرنے والے زعماءِ اُمت میں ڈاکٹر سید سلمان ندوی (خلف الرشید مولانا سید سلیمان ندویؒ)' مولانا فضل الرحیم اشرفی' مولانا علامہ ابوعمار زاہد الراشدی' مولانا ڈاکٹر صہیب حسن (خلف الرشید مولانا عبدالغفار حسنؒ)' ڈاکٹر باسط بلال کوشل (لمز یونیورسٹی' لاہور) جناب سہیل عمر (اقبال اکیڈمی)' ڈاکٹر محمد سعد صدیقی (پنجاب یونیورسٹی' لاہور) پروفیسر سلیم منصور خالد (پروفیسر صاحب خود تشریف نہ لا سکے تاہم انہوں نے اپنا مقالہ بعنوان ''بیدار عزائم ہوتے ہیں' اسرار نمایاں ہوتے ہیں'' ارسال کر دیا جسے تقریب میں پڑھ کر سنایا گیا)' محمد عمار خان ناصر (ماہنامہ الشریعہ' گوجرانوالہ)' انجینئر نوید احمد (قرآن اکیڈمی کراچی)' ڈاکٹر عبدالسمیع (قرآن اکیڈمی فیصل آباد) شامل ہیں۔

دو دنوں کے صدارتی خطبات کی ذمہ داری علی الترتیب محترم حافظ عاکف سعید (خلف الرشید ڈاکٹر اسرار احمدؒ امیر تنظیم اسلامی) اور ڈاکٹر ابصار احمد (صدر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور) نے ادا کی۔

مرکزی انجمن خدام القرآن کے فورم سے اس قسم کے اجتماعات کا انعقاد اگرچہ کوئی نیا اور غیر معمولی واقعہ نہیں' تاہم اس اعتبار سے یہ تقریب بالکل منفرد تھی کہ سابقہ تمام تقریبات کے برخلاف اس تقریب میں وہ ہستی پہلی بار غائب کے صیغے میں مذکور تھی جو اَب سے پہلے ہمیشہ ''واحد متکلّم'' کے صیغے میں اپنی پوری آن بان کے ساتھ ہمارے مابین موجود ہوتی تھی۔ لیکن راقم کو یہ کہنے میں بالکل تردّد اور تکلف نہیں کہ دارِ البقیٰ کو کوچ کر جانے کے

باوجود وہ اپنے تذکرے کے حوالے سے پہلے سے بھی شاندار انداز میں ''شریکِ محفل'' رہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔ محترم ڈاکٹر صہیب حسن صاحب نے اس موقع پر جو مقالہ پیش کیا وہ نذرِ قارئین ہے۔ ان شاء اللہ دیگر مقالات میں سے بھی چنیدہ منتخب مواد آئندہ کے شماروں میں شامل کیا جاتا رہے گا۔

حافظ نذیر احمد ہاشمی کی تحقیق بسلسلہ ''شریعت اسلامی میں شراب نوشی کی سزا'' تیسری قسط میں اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے' اگرچہ بعض حوالوں سے یہ بحث تاحال نامکمل ہے۔ اصحاب علم وفضل کے لیے تحقیق کے ان پہلوؤں کو مضمون کے آخر میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس بحث کو آگے بڑھانے' بلکہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے حوالے سے حکمتِ قرآن کو بھیجے جانے والے علمی مضامین کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی عظیم اور نابغہ روزگار شخصیت' ان کے بعد آنے والے ہر دور کے مصلحین اُمت کی توجہات کا مرکز رہی ہے اور رہے گی۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے مطابق دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان جیسی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی' اور اس میں ہرگز کوئی شک وشبہ نہیں کہ وہ واقعتاً دورِ جدید کے فاتح ہیں۔ حکمتِ قرآن کے قارئین کے سامنے حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی اور عملی کارناموں کا تذکرہ متنوع اسالیب سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ حالیہ شمارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مسلک اعتدال کی توضیح پر مشتمل پروفیسر عبدالماجد اور ڈاکٹر ایاز خان کا مضمون' جو بطورِ خاص حکمت قرآن کے لیے رقم کیا گیا' شامل کیا گیا ہے۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے تاہم اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے مسلک اعتدال کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔

دینِ اسلام کی دعوت اور اس کے تقاضوں پر مبنی انتہائی اہم کتاب

مُطالباتِ دین

مشتمل بر

❁ عبادتِ ربّ ❁ فریضہ شہادت علی الناس ❁ فریضہ اقامتِ دین

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

نیا ایڈیشن نئے گیٹ اپ اور نئی آب وتاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

صفحات: 120 قیمت: 75 روپے

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

سُورۃ الزُّمر

ویسے تو قرآن مجید کا ہر حرف اور ہر لفظ اللہ کا کلام ہونے کے سبب اپنی اپنی جگہ انتہائی اہمیت وعظمت کا حامل ہے' لیکن اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے سورۃ الزمر' سورۃ المؤمن' سورۂ حٰمٓ السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ' یہ چاروں سورتیں میری محبوب ترین سورتیں ہیں اور مجھے ان سے ایک خاص قلبی تعلق ہے۔ ان کا موضوع توحیدِ عملی ہے۔ توحید کے دو پہلو اچھی طرح سمجھ لیے جانے چاہئیں۔ ایک ہے توحید علمی' توحید نظری یا توحید فی العقیدہ' یعنی اللہ کو ایک ماننا اور جاننا' اس کی صفات میں کسی کو اس کا ساتھی یا مدمقابل نہ سمجھنا۔ دوسرا پہلو ہے توحید عملی' یعنی انسان اپنی بندگی اور محبت واطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لے۔ اس کو امام ابن تیمیہ ؒ نے ''توحید فی القلب'' سے تعبیر کیا ہے۔ اصل میں یہاں انسان کا ٹیسٹ ہوتا ہے' اس لیے کہ کسی چیز کو ماننا کوئی مشکل بات نہیں' لیکن عملی طور پر اس کو اپنی زندگی میں جاری وساری کر لینا بہت مشکل اور کٹھن کام ہے۔ پھر اس کے بھی دو پہلو ہیں: ایک انفرادی جو انسان کی اپنی ذات تک محدود ہے اور دوسرا اجتماعی سطح پر کہ یہی عمل (توحید عملی) پوری قوم اختیار کر لے اور ملک کے اندر یہ نظام قائم ہو جائے کہ مطاعِ مطلق اور حاکمِ حقیقی اللہ کی ذات ہو۔ اس تمہید کے تناظر میں سورۃ الزمر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کا مضمون انفرادی سطح پر توحید عملی ہے۔ سورۃ کا آغاز ہوتا ہے:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝٢ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ﴾

''کتاب کا نزول ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست حکمت والا ہے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ پر ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے' لہٰذا آپ اللہ ہی کی بندگی کریں دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار! دین خالص اللہ ہی کا حق ہے۔''

یہ اس سورت کا مرکزی خیال ہے کہ بندگی کرو اللہ کی' خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنی اطاعت کو۔

اس کی اطاعت کے تابع تو کسی کی اطاعت ہوسکتی ہے لیکن علی الاطلاق اور اس کی اطاعت سے آزاد ہو کر کسی کی اطاعت کر لی تو یہ شرک ہے' خواہ وہ اطاعت اپنے نفس' قوم' حاکم یا کسی ادارہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

آگے مشرکین کے شرک کے حوالے سے ایک خاص بات بیان ہوئی:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ ﴾

''اور جن لوگوں نے اُس (اللہ) کے سوا دوسروں کو اولیاء بنالیا (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔''

یہ بالکل وہی رویہ ہے جو آج کل مزاروں کے ساتھ ذہنی و قلبی تعلق کا ہے۔ آگے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا جا رہا ہے:

﴿قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ⑪ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ⑫ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑬ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ⑭﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی بندگی اور پرستش کروں دین اور اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ اور مجھے حکم ملا ہے کہ سب سے پہلا فرمانبردار میں خود بنوں۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ مجھے تو خود اندیشہ ہے بڑے دن کے عذاب کا اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ پھر کہو کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

مختلف اسلوب سے ایک ہی بات کی تکرار ہو رہی ہے۔ اگلی آیات میں طاغوت سے اجتناب کرنے والوں کے لیے بشارتوں کا ذکر ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ان کو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ' عقل مند اور ہوش مند قرار دیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ⑰ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑱﴾

''اور جو لوگ شیطانوں کی پیروی سے بچے اور اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لیے خوشخبری ہے۔ سو خوشخبری سنا دو میرے ان بندوں کو جو بات کو اچھی طرح سنتے ہیں اور پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی لوگ عقل والے ہیں۔''

آگے فرمایا:

''پھر بھلا جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے ربّ کی طرف سے ایک نور پر ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو کفر کی تاریکیوں میں پڑا ہے؟) پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہو گئے ہیں۔ یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔ اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات آپس میں ملتی جلتی اور بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں (جب وہ اس کتاب کو پڑھتے یا سنتے ہیں تو) ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر یادِ الٰہی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اللہ کا ہدایت دینا' وہ اس (کتاب) کے ساتھ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے (اور گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے) اور جس کو اللہ راہ

بھلا دے پھر اس کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔'' (آیات ۲۲۔۲۳)

آیات ۳۲۔۳۳ میں تکذیب اور تصدیق کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور سچ کی تکذیب کرے جب سچ اس کے پاس آ جائے؟ تو کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ دوزخ نہیں؟ اور وہ جو سچ لے کر آیا اور سچ کی تصدیق کی' یہی لوگ متقی ہیں۔''

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے آیت ۳۲ کی تفسیر میں فرمایا: ''اگر نبی نے (معاذ اللہ) جھوٹا خدا کا نام لیا تو اس سے برا کون اور اگر وہ سچا تھا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے برا کون؟'' اس طرح ''مَنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ'' اور ''كَذَّبَ بِالصِّدْقِ'' کا مصداق الگ الگ قرار دیا۔

آیت ۳۳ کی تفسیر میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ''جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ کو مانا وہ مؤمن ہے''۔ اس طرح ''جَآءَ بِالصِّدْقِ'' اور ''صَدَّقَ بِهٖ'' کا مصداق بھی الگ الگ ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک ہی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ یعنی ایک شخص کا اپنا کردار بھی سچائی پر مبنی ہے اور جہاں کہیں اس کے سامنے سچائی آتی ہے' وہ فوراً اس کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

آیت ۳۶ اور ۳۸ کے دو فقرے ایسے ہیں' جو مراقبہ کے لائق ہیں' یعنی ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور بار بار انہیں تازہ کرتے رہنا چاہیے۔ فرمایا: ﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ﴾ ''کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟'' اور ﴿قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: میرے لیے میرا اللہ کافی ہے' اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔''

جو شخص واقعتاً اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے تو پھر اسے یقین رکھنا چاہیے کہ میرے لیے صرف اللہ کافی ہے۔ وسائل و ذرائع پر انحصار کرنا ایک علیحدہ بات ہے' لیکن وہ کبھی یہ نہ سمجھے کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ اس کا انحصار اور دار و مدار صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا اللہ کے ساتھ قلبی تعلق گہرا نہیں ہے۔

اس سورۃ کی آیت ۵۳ توبہ کے موضوع پر قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ بے شک وہ تو بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ کا آخری حصہ خصوصی طور پر توحید فی العبادت کے ضمن میں نہ صرف اس سورۃ بلکہ پورے قرآن مجید کا ذروۃ السنام (climax) ہے۔ بڑے تیکھے انداز میں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اے جاہلو! کیا تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں بھی اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگوں؟ اور (اے نبیؐ!) ہم آپ کو بھی یہ وحی کر چکے ہیں اور آپ سے پہلے والوں کو بھی کہ (بالفرض) اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ بھی خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔ بلکہ آپ اللہ ہی کی بندگی کریں اور شکر گزار بندے بن کر رہیں۔''

آیات ۶۷ سے سورۃ کے آخر تک قیامت اور جنّت و جہنم کی منظر کشی کی گئی ہے کہ قیامت کے دن زمین اللہ کی ایک مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا تو سب بے ہوش ہو جائیں گے، پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا تو بعث بعد الموت ہوگا اور زمین اپنے ربّ کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ پھر اعمال نامے رکھے جائیں گے، انبیاء اور شہداء آئیں گے اور پھر فیصلہ کیا جائے گا۔ کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے اور متقی مؤمنین کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو وہ کہیں گے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٧٤﴾﴾

''اللہ کا شکر ہے کہ جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں وارث بنایا جنت کی زمین کا کہ ہم جہاں چاہیں گھر بنائیں۔ سو کیا خوب بدلہ ہے محنت کرنے والوں کا!''

جب اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے فیصلے ہو جائیں گے تو اہل جنت دیکھیں گے کہ فرشتے اللہ کے عرش کے گرد چکّر لگا رہے ہوں گے اس کی تسبیح اور حمد کرتے ہوئے۔ اور فیصلہ ہو جائے گا ان کے درمیان حق کے ساتھ اور وہ یہی کہتے ہیں کہ کُل حمد اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔

سُورۃ المؤمن

اب وہ سات سورتیں آ رہی ہیں جنہیں ہم ''حوامیم'' یعنی حٰمٓ سیریز کی سورتیں کہتے ہیں۔ ان سب کی ابتدا ''حٰمٓ'' کے حروفِ مقطعات سے ہو رہی ہے۔ صرف سورۃ الشوریٰ میں ''حٰمٓ'' کے ساتھ ''عٓسٓقٓ'' کا اضافہ ہے۔ سورۃ المؤمن نو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کی چار بڑی پیاری شانوں کے ساتھ اس سورۃ کا آغاز ہوا ہے:

﴿حٰمٓ ﴿١﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٢﴾ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿٣﴾﴾

''ح م، نزول ہے اس کتاب کا اللہ کی جانب سے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا ہے۔ گناہ کا بخشنے

والا' توبہ کا قبول فرمانے والا' سخت عذاب دینے والا اور بڑی مقدرت اور قوت والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' اسی کی طرف لوٹنا ہے۔''

سورۃ الزمر کے آخری حصے میں فرشتوں کا ذکر آیا تھا کہ وہ اللہ کے عرش کے گرداگرد چکر لگا رہے ہوں گے اس کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے۔ یہاں آیات ۷ تا ۹ میں اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ فرشتے اللہ کی حمد کے ساتھ ساتھ اہلِ ایمان کے لیے استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔ جنت میں ان کے داخلے کی دعا کرتے ہیں اور جہنم کے عذاب اور برائیوں سے بچا لینے کی درخواست بھی کرتے ہیں۔

آگے آیت ۱۱ میں اہلِ جہنم کی فریاد نقل کی گئی ہے جو علمی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ فرمایا:

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾﴾

''وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار' تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اب یہ جو دو زندگیوں اور دو موتوں والی بات ہے یہ بہت بڑا علمی مسئلہ ہے' اس پر میں نے ایک مضمون ''حقیقتِ زندگی'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس مسئلہ کو سمجھ لیجیے۔ انسان کی پہلی تخلیق ارواح کی شکل میں عالمِ امر یا عالمِ ارواح میں ہوئی۔ یہی وہ پہلی زندگی ہے جس میں ارواحِ انسانیہ نے اللہ سے ''عہدِ الست'' کیا ہے۔ اس کے بعد ان ارواح کو سلا دیا گیا' یہ پہلی موت ہے۔ پھر ہمارا احیا ہوا اور اس دنیا میں آمد ہوئی' اب پھر موت آئے گی اور اس کے بعد آخرت کی زندگی ہوگی۔ اس طرح دو احیاء اور دو اموات ہیں۔ اپنی نشانیوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان سے سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔

آگے فرمایا: ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ''اور پکارو اللہ کو اسی کے لیے دین کو خالص کر کے خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ یہ بات سورۃ الزمر میں بھی کئی اسلوب سے آئی تھی۔ اب اس سورۃ میں بھی اس کا تذکرہ کر کے توحید عملی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عبادت کا دوسرا رُخ چونکہ دعا ہے اس لیے اس سورۃ میں دعا پر زیادہ زور ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کا بہت اہم مضمون جس سے مجھے خصوصی محبت ہے' وہ مومنِ آلِ فرعون کی ایک تقریر ہے۔ آیات ۲۳ تا ۴۵ میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کا ابتدائی تذکرہ ہے تاکہ پس منظر ذرا واضح ہو جائے اور پھر اس مومن آلِ فرعون کی تقریر نقل کی گئی ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ جب فرعون نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ایک آندھی کی شکل اختیار کر رہی ہے تو فرعون نے موسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا' لیکن اُس وقت تک آپؑ کی دعوت کافی پھیل چکی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کے خاندان کی ایک بڑی شخصیت بھی ایمان لا چکی تھی' لیکن اُس نے اپنے ایمان کو تا حال چھپا رکھا تھا۔ جب فرعون نے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی قرارداد پیش کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''میں پناہ میں آتا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر غرور کرنے والے سے جو حساب کے دن پر یقین نہ رکھے''۔ اس کے بعد مؤمن آلِ فرعون کھڑے ہوئے اور ایک نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تقریر

کی۔ پورے قرآن مجید میں کسی رسول کی بھی اس قدر طویل تقریر نقل نہیں ہوئی ہے جتنی اس مؤمن آل فرعون کی ہوئی ہے۔ انہوں نے دورانِ خطاب کہا:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸﴾

''(ہوش میں آؤ!) کیا تم اس شخص کو صرف اس جرم میں قتل کرنے کے درپے ہو کہ یہ کہتا ہے کہ میرا ربّ اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانیاں لے کر آیا ہے۔ اور اگر یہ جھوٹا ہے تو جھوٹ کا وبال اسی پر ہوگا اور اگر یہ سچا ہے تو تم کو وہ عذاب پہنچے گا جس سے یہ تمہیں خبردار کرتا ہے۔ یقیناً اللہ راہ یاب نہیں کرتا ان لوگوں کو جو حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے ہیں۔''

یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُس وقت کہے جب لوگوں نے نبی کریم ﷺ پر دست درازی کی تھی۔

اس کے بعد اس مؤمن آل فرعون نے لوگوں کو اللہ کے اُس عذاب سے بھی خبردار کیا جو پہلی قوموں مثلاً قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود پر آ چکا ہے اور دنیا کے عذاب کے علاوہ قیامت کے عذاب سے بھی خبردار کیا۔ مؤمنِ آلِ فرعون نے ان کو بتایا کہ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اسے ذہن نشین کر لو اور اگر آج تم نے میری بات نہ مانی تو ایک وقت آئے گا کہ تمہارے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ (آیات ۲۸ تا ۴۴)

آیت ۶۰ اس سورت کے مرکزی مضمون کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝۶۰﴾

''اور تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے بہت ہی ذلیل و خوار ہو کر۔''

درحقیقت دُعا ہی عبادت ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (ترمذی) اور اللہ سے دعا نہ کرنا ہی تکبّر ہے۔ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت ۶۵ اور ۶۶ میں وہی مضمون ہے جو پچھلی سورت میں بیان ہوا۔ فرمایا:

''وہ (اللہ) زندہ جاوید ہستی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس اُسی کو پکارو بندگی اور دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ کُل حمد و تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ مجھے تو منع کر دیا گیا ہے ان کی بندگی اور پرستش سے جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے نشانیاں آ چکی ہیں، اور مجھے یہی حکم ہوا ہے کہ میں تمام جہانوں کے رب کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں۔''

سُورۂ حٰم السّجدۃ

یہ سورۂ مبارکہ چھ رکوعوں پر مشتمل ہے۔اس کا زمانہ نزول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے پہلے کا ہے۔ روایت ہے کہ ایک روز کچھ سردارانِ قریش مسجدِ حرام میں جمع تھے اور مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ سے پریشان تھے۔اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک گوشہ میں تنہا تشریف فرما تھے۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے آپؐ کے پاس کچھ نصیحتیں کرنے کے ارادے سے پہنچا تا کہ آپؐ کو اپنے مشن سے باز آجانے پر آمادہ کیا جاسکے۔اس نے آپ سے کہا کہ دیکھو تم ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہو مگر تم نے اپنے پورے قبیلہ اور قوم کو اپنی دعوت کی وجہ سے تفرقہ میں مبتلا کر دیا ہے اور ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا ہے۔تمہاری باتوں سے تو یہ بھی لگتا ہے کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس کام سے اگر تمہارے کوئی خاص مقاصد ہیں تو ہم وہ پورا کرنے کے لیے تیار ہیں۔تمہیں مال چاہیے تو وہ تمہیں مل جائے گا' بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں' بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔اگر تمہیں کوئی بیماری لاحق ہے یا تم پر کوئی جن آتا ہے (معاذ اللہ' نقل کفر کفر نہ باشد) تو ہم اپنے خرچ پر تمہارا بہترین علاج کرا دیتے ہیں' لیکن یہ کام چھوڑ دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمام تقریر کے جواب میں اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت فرمائی اور عتبہ سے کہا کہ تم نے میرا جواب سن لیا! عتبہ جب اپنے ساتھیوں کی طرف واپس روانہ ہوا تو اس کا چہرہ متغیر تھا۔اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے جو خدا کی قسم' نہ شعر ہے' نہ سحر اور نہ کہانت۔ میری بات مانو تو اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو' یہ کلام کچھ نہ کچھ رنگ لا کر رہے گا۔اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو وہ اس سے خود نمٹ لیں گے اور تم اپنے بھائی پر ہاتھ اٹھانے سے بچ جاؤ گے' لیکن اگر وہ اہلِ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی اور عزت تمہاری ہی بادشاہی اور عزّت ہوگی۔

سورۂ مبارکہ کا آغاز ہوتا ہے:

﴿حٰمٓ ① تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ③ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ④﴾

''ح م' اس قرآن کا نزول اُس ہستی کی طرف سے ہے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں ایک قرآنِ عربی کی صورت میں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ (یہ قرآن) بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا ہے' مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے اعراض کیا گویا کہ وہ سنتے ہی نہیں۔''

آگے فرمایا کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ ''جس چیز کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا

ہے''۔اس کا جواب دیا گیا کہ تم خواہ اپنی آنکھیں اور کان بند کرلو اور دلوں پر غلاف چڑھالو مگر جان رکھو کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ آگے آیت ۱۳ میں ارشاد ہوا کہ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دیجیے کہ میں تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے خبردار کرتا ہوں' جیسا کہ عاد وثمود پر آیا تھا۔ آیات ۲۰'۲۱ میں فرمایا کہ قیامت کے روز جب لوگوں کا محاسبہ ہوگا تو ان کے کان' آنکھیں اور کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

آیت ۲۶ میں کفار کا ایک قول نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶﴾

''اور کہنے لگے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہ سنا کرو اس قرآن کو اور (جب یہ سنایا جائے تو) اس میں خلل ڈالو تاکہ تم غالب آجاؤ۔''

کفار کی نبی کریم ﷺ سے کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی' ان کی اصل عداوت اور دشمنی قرآن مجید سے تھی۔ انہوں نے آپس میں یہ طے کرلیا تھا کہ اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو مبادا اس کا اثر تمہارے دلوں تک پہنچ جائے اور تم اپنے باپ دادا کے دین سے پھر جاؤ۔ یعنی کفار بھی یہ مانتے تھے کہ اس قرآن کی تاثیر سے قلوب تبدیل ہوتے چلے جائیں گے۔

آیت ۳۰ سے ۳۶ تک سات آیات ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہیں۔ یہ آیات ذاتی سطح پر عبادت' توحید فی العبادت اور اخلاص فی العبادت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ فرمایا:

''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اُترتے ہیں کہ نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کو قریب آنے دو اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی' اور تمہارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کی خواہش تمہارے دل میں ہو اور تمہیں وہاں سب کچھ ملے گا جو تم مانگو گے۔ یہ مہمانی ہے غفور رحیم کی طرف سے۔ اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو' پھر تم دیکھو گے کہ وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی' وہ تمہارا دوست اور قرابت والا بن جائے گا۔ اور اس مقام تک صرف وہ پہنچتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہے' اور اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے مگر بڑے نصیب والے۔ اور اگر تمہیں شیطان کی طرف وسوسہ پیدا ہو تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو' وہ سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے۔'' (آیات ۳۰۔۳۶)

آخر میں اللہ ربّ العزت نے اپنی نشانیوں کے حوالے سے بتایا:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۵۳﴾

''ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور انفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح

ہو جائے کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ آپ کا ربّ ہر چیز کا شاہد ہے۔''

اس میں غالباً اشارہ ہے سائنسی ترقی کی جانب۔ سائنسی علوم میں جتنی بھی ترقی اور ارتقا آج تک ہوا ہے اس حوالہ سے ایک بھی ایسی حقیقت اب تک سامنے نہیں آئی جس سے قرآن کی بتائی ہوئی کوئی بات غلط ثابت ہوئی ہو۔ اس کے برعکس جیسے جیسے علمِ انسانی آگے بڑھ رہا ہے قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جا رہی ہے۔

سُورۃ الشُّوریٰ

پانچ رکوعوں پر مشتمل یہ سورۂ مبارکہ اپنے مضامین کے لحاظ سے سورۂ حٰمٓ السجدۃ کا تتمہ محسوس ہوتی ہے' اس لیے کہ آغازِ کلام کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اس کے پس منظر میں وہ چہ میگوئیاں ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور قرآن حکیم کے مضامین کے حوالہ سے پورے مکہ میں ہو رہی تھیں۔ اس سورہ میں بہت سے اہم مقامات ہیں۔ آیات ۱۳ تا ۱۵ میں توحید فی العبادہ اور اخلاص فی العبادہ کا معاملہ جو اجتماعی سطح پر ہونا چاہیے' بیان ہوا ہے:

''(اے نبی ﷺ!) آپ کے لیے (اللہ تعالیٰ نے) دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کی وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی گئی تھی' اور جو آپؐ کی جانب ہم نے وحی کی ہے اور جس کی ہدایت ہم نے کی تھی حضرات ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو کہ دین (جو ہم نے دیا ہے اس) کو قائم کرو (یہ بات یاد رکھیں کہ دین نہ تو کسی ریسرچ یا تحقیق کے لیے آیا ہے نہ ہی تصنیف و تالیف کے لیے' بلکہ اس کی غرض و غایت تو یہ ہے کہ یہ قائم ہو) اور اس کے بارے میں کسی تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ یہ بات مشرکین کے لیے بڑی بھاری اور ناگوار ہے جس کی طرف آپ ان کو دعوت دے رہے ہیں (یعنی اجتماعی سطح پر پورا نظامِ توحید پر قائم ہو جائے۔ یہ تو ان کے لیے پروانہ موت سے کم نہیں جس کو یہ ہرگز گوارا نہیں کریں گے۔) اللہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کو چاہے اور جو کوئی اس کی جانب رخ کرتا ہے اسے وہ ضرور ہدایت دیتا ہے۔ اور لوگوں نے جو تفرقہ ڈالا وہ اس کے بعد ڈالا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' یہ تو صرف آپس کی ضدم ضدا ہے۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک وقت مقرر تک کے لیے بات نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور جو لوگ ان کے بعد (اللہ کی) کتاب کے وارث ہوئے وہ اس کی طرف سے شبہ کی الجھن میں ہیں۔ تو (اے محمد ﷺ!) آپ اس کی دعوت دیتے رہیے اور ڈٹے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے' اور اعلان کر دیجیے کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔ اللہ ہی ہمارا ربّ ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی نہیں۔ ایک دن آنے والا ہے جب اللہ ہمیں جمع کرے گا اور بالآخر اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔'' (آیات ۱۳ تا ۱۵)

رزق کے حوالے سے اس سورۃ میں دو آیات (۱۹ اور ۲۷) ہیں۔ ارشاد ہوا: ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾﴾ ''اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ جس کو چاہتا ہے (وسیع) رزق دیتا ہے' اور وہ زور والا اور زبردست ہے''۔ آیت ۲۷ میں فرمایا: ﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ ''اور اگر اللہ اپنے (تمام) بندوں کے لیے رزق میں فراخی کر دیتا تو وہ زمین میں فساد کرنے لگتے۔ لیکن وہ جس قدر چاہتا ہے اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے''۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر ایک کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ سب زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے اور دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جاتا۔ امیر اور غریب کا یہ فرق ہی اس نظام کی بقا ہے۔

آیات ۲۸ سے ۳۵ تک' اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اگلی آیات (۳۶ تا ۳۹) میں مؤمنین کی صفات کو بیان کیا۔ فرمایا:

''جو کچھ تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے' اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی' وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کرتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اپنے معاملات مشورے سے چلاتے ہیں' اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں' اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو (مناسب طریقے سے) بدلہ لیتے ہیں۔'' (آیات ۳۶ تا ۳۹)

آیات ۴۰ تا ۴۳ میں ظلم و زیادتی پر انتقام لینے کی اجازت دی گئی جبکہ معاف اور درگزر کرنے کو بڑی ہمت کا کام قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

''اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے' مگر جو درگزر کرے اور (معاملے کو) درست کرے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔ یقیناً اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر بدلہ لے لے وہ شخص جس پر ظلم ہوا ہے تو ایسے شخص پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو تکلیف دہ عذاب ہوگا۔ اور جو صبر کرے اور (قصور) معاف کر دے تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

آیات ۴۹ اور ۵۰ میں اس حقیقت کو بیان کر دیا گیا کہ اولاد اور بیٹا بیٹی دینا صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾﴾

''تمام بادشاہت اللہ ہی کی ہے آسمانوں کی بھی اور زمین کی بھی۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے بخشتا ہے۔ یا کسی کو بیٹے اور بیٹیاں دونوں عطا فرماتا ہے' اور جس کو چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ یقیناً وہ جاننے والا اور قدرت والا ہے۔''

مجھے اس سورۂ مبارکہ (سورۃ الشوریٰ) سے انتہائی تعلق خاطر ہے اور میری نگاہ میں مدنی سورتوں میں جو مقام سورۃ الحدید کا ہے' مکی سورتوں میں وہی مقام سورۃ الشوریٰ کا ہے۔

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ النساء

آیت ۱۵۔۱۶

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ۝

ترکیب: ''یَاْتِیْنَ'' مضارع میں جمع مؤنث غائب کا صیغہ ہے' ''اَلْفَاحِشَةَ'' اس کا مفعول ہے (دیکھیں البقرۃ: ۲۳ کا نوٹ ۲)۔ ''اَرْبَعَةً'' تمیز ہے۔ ''یَتَوَفّٰی'' کا فاعل ''اَلْمَوْتُ'' ہے۔ ''یَاْتِیٰنِهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیر مفعولی ''اَلْفَاحِشَةَ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَالّٰتِیْ: اور جو عورتیں	یَاْتِیْنَ: کرتی ہیں
اَلْفَاحِشَةَ: بے حیائی	مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ: تمہاری عورتوں میں سے
فَاسْتَشْهِدُوْا: تو گواہ طلب کرو	عَلَیْهِنَّ: ان پر
اَرْبَعَةً: چار	مِّنْكُمْ: تم میں سے
فَاِنْ: پھر اگر	شَهِدُوْا: وہ لوگ گواہی دیں
فَاَمْسِكُوْهُنَّ: تو تم لوگ روکو ان کو	فِی الْبُیُوْتِ: گھروں میں
حَتّٰی: یہاں تک کہ	یَتَوَفّٰىهُنَّ: پورا پورا لے لے ان کو

الْمَوْتُ :موت	اَوْ :یا
يَجْعَلَ :بنائے	اللّٰهُ :اللہ
لَهُنَّ :ان کے لیے	سَبِيْلًا :کوئی راہ
وَالَّذٰنِ :اور جو دو مرد	يَاْتِيٰنِهَا :کرتے ہیں وہی (یعنی بے حیائی)
مِنْكُمْ :تم میں سے	فَاٰذُوْهُمَا :تو اذیت دو ان دونوں کو
فَاِنْ :پھر اگر	تَابَا :دونوں توبہ کریں
وَاَصْلَحَا :اور دونوں اصلاح کریں	فَاَعْرِضُوْا :تو تم درگزر کرو
عَنْهُمَا :دونوں سے	اِنَّ اللّٰهَ :یقیناً اللہ
كَانَ تَوَّابًا :توبہ قبول کرنے والا ہے	رَّحِيْمًا :رحم کرنے والا ہے

نوٹ ۱: ان آیات میں ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں سزا تجویز کی گئی ہے جن سے فاحشہ یعنی زنا کا صدور ہو جائے۔ اس کے ثبوت کے لیے چار گواہ طلب کیے جائیں گے۔ اگر چار سے کم لوگ گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے۔ ایسی صورت میں مدعی اور گواہ جھوٹے قرار دیے جاتے ہیں اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے ان پر حد قذف جاری کر دی جاتی ہے۔ ان دو آیتوں میں زنا کے لیے کوئی حد بیان نہیں کی گئی بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ان کو تکلیف پہنچاؤ اور زنا کار عورتوں کو گھروں میں بند کر دو۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان سے تعرض مت کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا کے بعد اگر توبہ کر لیں تو پھر انہیں ملامت نہ کرو اور مزید سزا مت دو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہو گئی کیونکہ آیت میں توبہ سزا کے بعد مذکور ہے۔

نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی ان دو آیتوں کی ترتیب یہ ہے کہ شروع میں تو ان میں ایذا کا حکم نازل ہوا اور اس کے بعد عورتوں کے لیے یہ حکم نازل ہوا کہ ان کو گھروں میں بند رکھا جائے یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا ان کی زندگی میں کوئی حکم آجائے۔ چنانچہ بعد میں وہ ''سبیل'' بیان کر دی گئی جس کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا تھا (ماخوذ از معارف القرآن)۔ مذکورہ حکم سورۃ النور کی آیت ۲ میں ہے جس کا مفہوم (ترجمہ نہیں) یہ ہے کہ ''زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین کے معاملے میں تمہیں ان پر ترس نہ آئے اگر تمہارا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ اور ان دونوں کو سزا دیتے وقت مؤمنوں میں سے ایک گروہ کا موقع پر موجود ہونا ضروری ہے''۔ یعنی مرد اور عورت دونوں کو برسرِ عام سزا دینا ضروری ہے خواہ ہم مغربی طاغوت کو منہ دکھانے کے قابل رہیں یا نہ رہیں۔ جس کا اللہ اور آخرت پر ایمان ہے اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ دنیا کو منہ دکھانا اس کا مسئلہ ہے جو زبان سے اللہ اور آخرت کا اقرار کر لے لیکن دل یقین سے خالی ہو۔

نوٹ ۲: شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا کا قرآن مجید میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں احادیث میں ملتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اکثر لوگوں کے ذہن الجھن کا شکار ہیں۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ ایسے لوگ حدیث کو اگر مانتے بھی ہیں تو اسے قرآن مجید سے کمتر درجہ کی چیز سمجھتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ یہ بات بالکل غلط ہے اور کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ سنی سنائی بات پر کوئی رائے قائم کرنے کے بجائے حدیث کی ضرورت واہمیت اور ثقاہت یعنی قابل اعتبار ہونے کے متعلق خود تحقیق کر کے کوئی رائے قائم کریں۔ اگر انہوں نے غیر متعصب ذہن کے ساتھ یہ تحقیق کی تو ان شاء اللہ سوا نیزے پر دمکتے ہوئے سورج کی طرح یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ قرآن اور حدیث الگ الگ دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی سکہ رائج الوقت کے دو رخ ہیں۔ اس سلسلہ میں البلاغ فاؤنڈیشن کے ''حدیث کا جائزہ'' کورس کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ مفید ہوگا۔

اس ذہنی الجھن کی دوسری وجہ بھی لاعلمی پر مبنی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے ماخذ قرآن اور حدیث ہیں۔ یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ اسلامی قوانین کی غالب اکثریت کے یہی دو ماخذ ہیں' لیکن صرف یہی دو نہیں ہیں۔ اسلامی قوانین کے کچھ اور ماخذ بھی ہیں جن کی وضاحت ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے ''خطباتِ بہاولپور'' میں کی ہے۔ ان میں سے ایک تورات ہے۔ اصول یہ ہے کہ تورات میں درج اللہ کے جن احکام کی قرآن وحدیث میں توثیق کر دی گئی وہ اب اسلامی قوانین کا حصہ ہیں۔

اب نوٹ کر لیں کہ رجم کی سزا تورات میں درج ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل کر کے اس کے اسلامی قانون ہونے کی حیثیت کو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر کر دیا ہے۔

آیات ۱۷۔۱۸

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

ع ت د

عَتُدَ يَعْتُدُ (ک) عَتَادًا : تیار ہونا' آمادہ ہونا۔

عَتِيْدٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت): تیار۔ ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝۱۸﴾ (ق) ''وہ منہ سے نہیں نکالتا کوئی بات مگر یہ کہ اس کے پاس ہوتا ہے ایک تیار محافظ۔''

اَعْتَدَ ۔ يُعْتِدُ (افعال) اِعْتَادًا : تیار کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''اَلتَّوْبَةُ'' مبتدأ ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے جو کہ ''ثَابِتٌ'' ہو سکتی ہے۔ ''عَلَى اللّٰهِ'' اور ''لِلَّذِيْنَ'' دونوں متعلق خبر ہیں۔ ''اَلسُّوْءَ'' صفت ہے' اس کا موصوف ''اَلْفِعْلَ'' یا ''اَلْعَمَلَ'' محذوف ہے۔ ''اَلتَّوْبَةُ'' اسم ہے ''لَيْسَ'' کا' اس کی خبر بھی محذوف ہے اور یہاں ''عَلَى اللّٰهِ'' بھی محذوف ہے' ''لِلَّذِيْنَ'' اور ''وَلَا الَّذِيْنَ'' دونوں متعلق خبر ہیں۔

ترجمہ:

اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	التَّوْبَةُ :توبہ (یعنی اپنی رحمت کے ساتھ رجوع کرنا تو ثابت) ہے
عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر	لِلَّذِيْنَ :ان لوگوں کے لیے جو
يَعْمَلُوْنَ :کرتے ہیں	السُّوْٓءَ :برا (کام)
بِجَهَالَةٍ :نادانی میں	ثُمَّ :پھر
يَتُوْبُوْنَ :وہ لوگ توبہ کرتے ہیں	مِنْ قَرِيْبٍ :قریب (یعنی جلدی) سے
فَاُولٰٓئِكَ :تو یہ لوگ ہیں	يَتُوْبُ :توبہ قبول کرتا ہے
اللّٰهُ :اللہ	عَلَيْهِمْ :جن کی
وَكَانَ اللّٰهُ :اور اللہ ہے	عَلِيْمًا :جاننے والا
حَكِيْمًا :حکمت والا	وَلَيْسَتِ :اور (ثابت) نہیں ہے
التَّوْبَةُ :توبہ (اللہ پر)	لِلَّذِيْنَ :ان لوگوں کے لیے جو
يَعْمَلُوْنَ :عمل کرتے رہتے ہیں	السَّيِّاٰتِ :برائیوں کا
حَتّٰٓى :یہاں تک کہ	اِذَا :جب
حَضَرَ :سامنے آتی ہے	اَحَدَهُمُ :ان کے کسی ایک کے
الْمَوْتُ :موت	قَالَ :تو وہ کہتا ہے
اِنِّيْ تُبْتُ :بے شک میں توبہ کرتا ہوں	الْـٰٔنَ :اب
وَلَا الَّذِيْنَ :اور نہ ہی ان کے لیے جو	يَمُوْتُوْنَ :مرتے ہیں
وَ :اس حال میں کہ	هُمْ :وہ
كُفَّارٌ :کفر کرنے والے ہیں	اُولٰٓئِكَ :یہ لوگ ہیں
اَعْتَدْنَا :ہم نے تیار کیا	لَهُمْ :جن کے لیے
عَذَابًا اَلِيْمًا :ایک دردناک عذاب	

نوٹ ۱: پہلے یہ سمجھ لیں کہ توبہ کسے کہتے ہیں۔ کیونکہ قبول ہونے یا قبول نہ ہونے کا سوال صرف سچی توبہ سے متعلق ہے۔ جھوٹی توبہ کا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سچی توبہ کے تین اجزاء ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے کیے پر ندامت ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آئندہ وہ کام نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اپنے کیے کی تلافی کرے، مثلاً نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی قضا کرے، کسی کا حق مارا ہے تو اسے ادا کرے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی مانگے، کوئی ایسا شخص وفات پا چکا ہے تو اس کے لیے دعائے مغفرت کرے، وغیرہ۔

یہ بھی سمجھ لیں کہ خطا کا صدور، پھر اس پر ندامت اور اعتراف، انسانیت کا عطر ہے۔ اگر کبھی خطا نہ کرے تو انسان فرشتہ ہو جائے گا، یعنی مسجود کے بجائے ساجد ہو جائے گا۔ اگر خطا پر نادم نہ ہو اور اس کا اعتراف نہ کرے تو انسان شیطان ہو جائے گا (ماخوذ از معارف القرآن)۔ اس حوالے سے اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ غلطی کرنا اتنی بری بات نہیں ہے۔ برائی کی اصل جڑ یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرے۔

نوٹ ۲: اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان سچی توبہ کرے تو اس کی قبولیت کا کیا امکان ہے۔ آیت ۱۷ میں اس کے لیے پہلی شرط ''بِجَهَالَةٍ'' ہے۔ اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ انجانے میں گناہ کرے تب توبہ قبول ہوگی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ گناہ کے انجام اور عذاب سے غفلت اس کا سبب بن گئی ہو خواہ وہ اسے گناہ جانتا ہو اور قصداً کیا ہو۔ جیسے یوسف علیہ السلام سے ان کے بھائیوں نے جو کیا قصداً کیا تھا پھر بھی قرآن مجید میں اسے جہالت کہا گیا ہے (یوسف: ۸۹)۔ اس لیے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص قصداً گناہ کرے، تو اس کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے اگر وہ سچی توبہ کرے۔

اسی آیت میں توبہ کی قبولیت کے لیے دوسری شرط ''مِنْ قَرِيْبٍ'' ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قریب کا کیا مطلب ہے؟ اس کی وضاحت ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک بندے پر غرغرہ نہ طاری ہو جائے۔ اس طرح مِنْ قَرِيْبٍ کا مطلب ہے کہ انسان کا عرصۂ حیات قلیل ہے اور موت اس کے بالکل قریب ہے (ماخوذ از معارف القرآن)۔

آیات ۱۹ تا ۲۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝

ع ش ر

عَشَرَ يَعْشِرُ ۔ عَشَرَ يَعْشُرُ (ض۔ن) عَشْرًا: نو میں شامل ہو کر دسواں ہونا۔

عَشْرٌ (اسم العدد): دس۔ ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الانعام: ۱۶۰) ''جو آیا نیکی کے ساتھ تو اس کے لیے اس کی جیسی دس ہیں۔''

مِعْشَارٌ: دسواں حصہ یعنی 1/10۔ ﴿وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ﴾ (سبا: ۴۵) ''اور وہ لوگ نہیں پہنچے اس کے دسویں حصے کو جو ہم نے دیا ان کو۔''

عُشَرَاءُ ج عِشَارٌ: دس ماہ کی حاملہ اونٹنی جس کا وضع حمل کا وقت قریب ہو۔ ﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ﴾ (التکویر) ''اور جب حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی۔''

عِشْرُوْنَ : بیس۔ ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ (الانفال:٦٥) ''اگر ہوں تم لوگوں میں بیس ثابت قدم تو وہ غالب ہوں گے دوسو پر۔''

عَشِيْرٌ (فَعِيْلٌ کا وزن اسم الفاعل کے معنی میں): شامل ہونے والا یعنی ساتھی، رفیق۔ ﴿لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ﴾ (الحج) ''یقیناً بہت ہی برا کارساز ہے اور یقیناً بہت ہی برا رفیق ہے۔''

عَشِيْرَةٌ: قبیلہ، برادری، رشتہ دار۔ ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشُّعراء) ''اور آپ خبردار کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔''

مَعْشَرٌ: جماعت، گروہ۔ ﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ﴾ (الانعام:١٢٨) ''اے جنوں کے گروہ! تم نے بہت حاصل کر لیے انسانوں میں سے۔''

عَاشَرَ (مفاعلہ) مُعَاشَرَةً: باہم مل جل کر رہنا۔

عَاشِرْ (فعل امر): تو مل جل کر رہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

ف ض و

فَضَا يَفْضُوْ (ن) فَضَاءً: کسی چیز یا جگہ کا کشادہ ہونا۔

اَفْضٰى (افعال) اِفْضَاءً: کشادہ کرنا، صحبت کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

م ق ت

مَقَتَ ۔ يَمْقُتُ (ن) مَقْتًا: نفرت کرنا، بیزار ہونا۔

مَقْتٌ (اسم ذات): نفرت، بیزاری۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''لَا يَحِلُّ'' میں لام کی ضمہ بتا رہی ہے کہ یہ مضارع مجزوم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس سے پہلے لائے نفی ہے، اس کو لائے نہی ماننا ممکن نہیں ہے۔ اس کے آگے ''اَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا'' پورا جملہ ''لَا يَحِلُّ'' کا فاعل ہے۔ اس جملے میں ''تَرِثُوْا'' کا فاعل اس میں ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے، ''النِّسَاءَ'' اس کا مفعول ہے اور ''كَرْهًا'' حال ہے۔ ''لَا تَعْضُلُوْا'' فعل نہی ہے۔ ''يَجْعَلَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ ''عَسٰى اَنْ'' پر عطف ہے۔ ''اٰتَيْتُمُوْهُنَّ'' کا مفعول ''ہٗ'' کی ضمیر ہے جو ''قِنْطَارًا'' کے لیے ہے، جبکہ ''بُهْتَانًا'' اور مرکب توصیفی ''اِثْمًا مُّبِيْنًا'' دونوں حال ہیں۔ ''فَاحِشَةً'' اور ''مَقْتًا'' ''كَانَ'' کی خبر ہیں۔ ''سَاءَ'' فعل ماضی ہے لیکن اس کا ترجمہ حال میں ہوگا (البقرۃ:٤٩، نوٹ ٢)۔ ''سَبِيْلًا'' تمیز ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اے لوگو جو ایمان لائے ہو

لَا يَحِلُّ: حلال نہیں ہوتا

لَكُمْ: تمہارے لیے

اَنْ: کہ

تَرِثُوا :تم لوگ وارث بنو
كَرْهًا :زبردستی
لِتَذْهَبُوْا :تاکہ تم لوگ لے جاؤ
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ :تم لوگوں نے دیا ان کو
يَّاْتِيْنَ :وہ کریں
وَعَاشِرُوْهُنَّ :اور تم لوگ مل جل کر رہو ان سے
فَاِنْ :پھر اگر
فَعَسٰٓى :تو ہوسکتا ہے
تَكْرَهُوْا :تم لوگ ناپسند کرو
وَّ :حالانکہ
اللّٰهُ :اللہ
خَيْرًا كَثِيْرًا :بہت زیادہ بھلائی
اَرَدْتُّمُ :تم لوگ ارادہ کرو
مَّكَانَ زَوْجٍ :کسی بیوی کی جگہ
اِحْدٰىهُنَّ :ان کی کسی ایک کو
فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ :تم لوگ مت لو اس میں سے
اَتَاْخُذُوْنَهٗ :کیا تم لوگ لیتے ہو اس کو
وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا :اور کھلا گناہ ہوتے ہوئے
تَاْخُذُوْنَهٗ :تم لوگ لوگے اس کو
قَدْ اَفْضٰى :صحبت کر چکا ہے
اِلٰى بَعْضٍ :کسی سے
مِنْكُمْ :تم سے
وَلَا تَنْكِحُوْا :اور تم لوگ نکاح مت کرو
نَكَحَ :نکاح کیا
مِّنَ النِّسَآءِ :عورتوں میں سے
مَا :جو
اِنَّهٗ :یقیناً یہ
فَاحِشَةً :بے حیائی
وَسَآءَ :اور برا ہے
النِّسَآءَ :عورتوں کے
وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ :اور تم لوگ مت روکو ان کو
بِبَعْضِ مَآ :اس کے بعض کو جو
اِلَّآ اَنْ :سوائے اس کے کہ
بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ :کوئی کھلی بے حیائی
بِالْمَعْرُوْفِ :بھلے طریقے سے
كَرِهْتُمُوْهُنَّ :تم لوگ ناپسند کرو ان کو
اَنْ :کہ
شَيْئًا :کسی چیز کو
يَّجْعَلَ :(ہوسکتا ہے کہ) پیدا کرے
فِيْهِ :اس میں
وَاِنْ :اور اگر
اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ :کسی بیوی کا بدلے میں لینا
وَّاٰتَيْتُمْ :اور تم نے دیا ہو
قِنْطَارًا :ایک ڈھیر (مال)
شَيْئًا :کوئی چیز
بُهْتَانًا :جھوٹا الزام لگاتے ہوئے
وَكَيْفَ :اور کیسے
وَ :درآنحالیکہ
بَعْضُكُمْ :تم میں سے کوئی
وَّاَخَذْنَ :اور انہوں نے لیا
مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا :ایک پکا وعدہ
مَا :اس سے، جس سے
اٰبَآؤُكُمْ :تمہارے اجداد نے
اِلَّا :سوائے اس کے کہ
قَدْ سَلَفَ :گزر گیا ہے
كَانَ :ہے
وَّمَقْتًا :اور بیزاری
سَبِيْلًا :بلحاظ راستے کے

نوٹ: ان آیات میں ان غلط رسوم کی ممانعت ہے جو اسلام سے پہلے خواتین کے ضمن میں عام تھیں۔ عورت کی جان اور مال کو مرد کی ملکیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وارث اس کے ترکہ کی طرح اس کی بیوہ کے بھی مالک بن جاتے تھے۔ اُس سے اگر خود نکاح کرتے تو مہر نہیں ادا کرتے تھے اور اگر کسی دوسرے سے نکاح کراتے تو مہر خود رکھ لیتے تھے۔ بیوی کو اگر میکے یا کہیں اور سے کوئی چیز ملتی تو شوہر اس کا مالک ہوتا تھا۔ اس طرح کی اور رسومات کی نفی کرتے ہوئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عورت کی شخصیت کے حق کو اور اس کے حق ملکیت کو تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے۔

آیات ۲۳۔۲۴

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

ع م م

عَمَّ۔ یَعُمُّ (ن) عُمُوْمًا: کسی چیز کا عام ہونا۔

عَمٌّ ج اَعْمَامٌ: چچا۔ ﴿وَبَنٰتِ عَمِّكَ﴾ (الاحزاب: ۵۰) ''اور تمہارے چچا کی بیٹیاں۔'' ﴿اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ﴾ (النور: ۶۱) ''یا تمہارے چچاؤں کے گھر۔''

عَمَّةٌ ج عَمّٰتٌ: پھوپھی۔ آیت زیر مطالعہ۔

عَمَّ: اس کا مادہ ''ع م م'' نہیں ہے بلکہ یہ ''عَنْ مَا'' کی ادغام شدہ شکل ہے۔ ﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱﴾ (النبا) ''کس کے بارے میں یہ لوگ باہم پوچھتے ہیں؟''

خ و ل

خَالَ۔ یَخُوْلُ (ف) خَوْلًا: غلاموں والا ہونا۔ مالک۔

خَالٌ ج اَخْوَالٌ: ماموں۔ ﴿وَبَنٰتِ خَالِكَ﴾ (الاحزاب: ۵۰) ''اور تمہارے ماموں کی بیٹیاں۔'' ﴿اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ﴾ (النور: ۶۱) ''یا تمہارے ماموؤں کے گھر۔''

خَالَةٌ ج خَالَاتٌ: خالہ۔ آیت زیر مطالعہ۔

خَوَّلَ۔ یُخَوِّلُ (تفعیل) تَخْوِیْلًا: مالک بنانا' عطا کرنا۔ ﴿وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ﴾

(الانعام:۹٤) ''اور تم لوگ چھوڑ آئے اس کو جو ہم نے عطا کیا تم کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے۔''

ص ل ب

صَلَبَ۔ یَصْلُبُ (ن) صَلْبًا :ہڈیوں سے گودا نکالنا۔سولی پر چڑھانا (قتل کرنے کے لیے)۔ ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (النساء:۱۵۷) ''ان لوگوں نے قتل نہیں کیا اس کو اور نہ ان لوگوں نے سولی چڑھایا اس کو۔''

صُلْبٌ ج اَصْلَابٌ: ریڑھ کی ہڈی' پیٹھ۔﴿یَخْرُجُ مِنْۢ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ۝﴾ (الطارق) ''وہ نکلتا ہے پیٹھ اور سینوں کے درمیان سے۔''

صَلَّبَ (تفعیل) تَصْلِیْبًا : سولی چڑھانا' پھانسی دینا۔﴿وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ (طٰہٰ:۷۱) ''اور میں لازماً سولی چڑھاؤں گا تم لوگوں کو کھجور کے تنوں پر۔''

ح ص ن

حَصُنَ ۔ یَحْصُنُ (ک) حَصَانَةً :مضبوط و مستحکم ہونا' محفوظ ہونا۔

حِصْنٌ ج حُصُوْنٌ: مضبوط جگہ' قلعہ۔﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (الحشر:۲) ''اور ان لوگوں نے گمان کیا کہ بچانے والے ہیں ان کو ان کے قلعے اللہ سے۔''

اَحْصَنَ (افعال) اِحْصَانًا: حفاظت کرنا' بچانا' محفوظ کرنا۔﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْۚ﴾ (الانبیاء:۸۰) ''اور ہم نے سکھایا اس کو ایک لباس بنانا تمہارے لیے تا کہ وہ تمہاری حفاظت کرے تمہاری جنگ میں۔''

مُحْصِنٌ (اسم الفاعل) :حفاظت کرنے والا۔آیت زیر مطالعہ۔

مُحْصَنَةٌ (اسم المفعول) :محفوظ کی ہوئی۔اس بنیادی مفہوم کے ساتھ قرآن مجید میں متعدد مفاہیم میں آیا ہے: (۱) شادی شدہ خاتون۔آیت زیر مطالعہ۔(۲) آزاد خاتون' یعنی جو کنیز نہ ہو۔خاندانی لڑکی۔﴿اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (النساء:۲۵) ''کہ وہ نکاح کرے خاندانی مسلمان عورت سے۔'' (۳) پارسا' پاک دامن۔﴿وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ﴾ (النور:٤) ''اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں پاک دامن عورتوں پر۔''

حَصَّنَ (تفعیل) تَحْصِیْنًا :بہت مضبوط کرنا' خوب پختہ کرنا۔

مُحَصَّنَةٌ (اسم المفعول) : بہت مضبوط کی ہوئی۔﴿لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَةٍ﴾ (الحشر:۱٤) ''وہ لوگ جنگ نہیں کریں گے تم لوگوں سے سب مل کر مگر قلعہ بند بستیوں میں۔''

تَحَصَّنَ (تفعل) تَحَصُّنًا :خود کو محفوظ کرنا' بچنا۔﴿اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (النور:۳۳) ''اگر وہ عورتیں ارادہ کریں بچنے کا۔''

س ف ح

سَفَحَ (ف) سَفْحًا :خون یا آنسو وغیرہ بہانا۔

مَسْفُوْحٌ (اسم المفعول) :بہایا ہوا۔﴿اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا﴾ (الانعام:۱٤۵) ''یا بہایا ہوا خون۔''

سَافَحَ (مفاعلہ) سِفَاحًا: ایک دوسرے سے بڑھ کر بہانا۔ پھر بدکاری کرنے کے معنی میں آتا ہے۔
مُسَافِحٌ (اسم الفاعل) :بدکاری کرنے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''حُرِّمَتْ'' ماضی مجہول ہے۔ اس کے آگے جو رشتے مذکور ہیں وہ سب اس کے نائب فاعل ہیں اس لیے ان کے مضاف حالت رفع میں آئے ہیں۔ ''اَنْ تَجْمَعُوْا'' سے پہلے ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ'' محذوف ہے۔ ''كِتٰبَ اللّٰهِ'' کو فعل محذوف کا مفعول مطلق بھی مانا جا سکتا ہے' لیکن بہتر ہے کہ اس کو حال مانا جائے۔ ''اَنْ تَبْتَغُوْا'' کا مفعول ''هُنَّ'' محذوف ہے۔ ''مُحْصِنِيْنَ'' حال ہونے کی وجہ سے حالت نصبی میں ہے۔ ''غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ'' میں ''غَيْرَ'' کی نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے' جبکہ ''مُسٰفِحِيْنَ'' اس کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہوا ہے۔

ترجمہ:

حُرِّمَتْ :حرام کی گئیں	عَلَيْكُمْ :تم لوگوں پر
اُمَّهٰتُكُمْ :تمہاری مائیں	وَبَنٰتُكُمْ :اور تمہاری بیٹیاں
وَاَخَوٰتُكُمْ :اور تمہاری بہنیں	وَعَمّٰتُكُمْ :اور تمہاری پھوپھیاں
وَخٰلٰتُكُمْ :اور تمہاری خالائیں	وَبَنٰتُ الْاَخِ :اور بھائی کی بیٹیاں
وَبَنٰتُ الْاُخْتِ :اور بہن کی بیٹیاں	وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ :اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے
اَرْضَعْنَكُمْ :دودھ پلایا تم کو	وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ :اور تمہاری دودھ شریک بہنیں
وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ :اور تمہاری عورتوں (بیویوں) کی مائیں	وَرَبَآئِبُكُمُ :اور تمہاری زیر تربیت بیٹیاں
الّٰتِيْ :جو	فِيْ حُجُوْرِكُمْ :تمہاری گودوں میں ہیں
مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ :تمہاری ان عورتوں سے	دَخَلْتُمْ :تم داخل ہوئے
بِهِنَّ :جن میں	فَاِنْ :پھر اگر
لَمْ تَكُوْنُوْا :تم نہیں ہوئے	دَخَلْتُمْ :داخل
بِهِنَّ :ان میں	فَلَا جُنَاحَ :تو کوئی گناہ نہیں ہے
عَلَيْكُمْ :تم پر	وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ :اور تمہارے بیٹوں کی بیویاں
الَّذِيْنَ :جو	مِنْ اَصْلَابِكُمْ :تمہاری پیٹھوں سے ہیں
وَاَنْ :اور (حرام کیا گیا تم پر) کہ	تَجْمَعُوْا :تم جمع کرو
بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ :دو بہنوں کے درمیان	اِلَّا :سوائے اس کے کہ

مَا : جو
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
غَفُوْرًا : بے انتہا بخشنے والا
وَّالْمُحْصَنٰتُ : اور شادی شدہ خواتین (بھی)
اِلَّا : سوائے اس کے کہ
مَلَكَتْ : مالک ہوئے
كِتٰبَ اللّٰهِ : اللہ کا لکھا ہوا ہوتے ہوئے
وَاُحِلَّ : اور حلال کیا گیا
مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ : جو اس کے علاوہ ہے
تَبْتَغُوْا : تم لوگ چاہو (ان کو)
مُّحْصِنِيْنَ : حفاظت کرنے والے ہوتے ہوئے
فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ : پھر جو تم نے فائدہ حاصل کیا
مِنْهُنَّ : ان میں سے
اُجُوْرَهُنَّ : ان کے حقوق
وَلَا جُنَاحَ : اور کوئی گناہ نہیں ہے
فِيْمَا : اس میں
بِهٖ : جس پر
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
عَلِيْمًا : جاننے والا

قَدْ سَلَفَ : گزر گیا ہے
كَانَ : ہے
رَّحِيْمًا : ہر حال میں رحم کرنے والا
مِنَ النِّسَآءِ : عورتوں میں سے
مَا : جن کے
اَيْمَانُكُمْ : تمہارے داہنے ہاتھ
عَلَيْكُمْ : تم پر
لَكُمْ : تمہارے لیے
اَنْ : کہ
بِاَمْوَالِكُمْ : اپنے مال سے
غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ : بدکاری نہ کرنے والے ہوتے ہوئے
بِهٖ : جس سے
فَاٰتُوْهُنَّ : تو تم لوگ دو ان کو
فَرِيْضَةً : فرض ہوتے ہوئے
عَلَيْكُمْ : تم پر
تَرٰضَيْتُمْ : تم لوگ باہم راضی ہوئے
مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ : فرض کے بعد
كَانَ : ہے
حَكِيْمًا : حکمت والا

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 25 روپے

حفظِ قرآن کی اہمیت

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ ؓ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ : ((لَوْ جُعِلَ الْقُرْآنُ فِيْ اِهَابٍ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ مَا احْتَرَقَ)) (سنن الدارمی)

حضرت عقبہ بن عامر ؓ کہتے ہیں' میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اگر رکھ دیا جائے قرآن مجید کو کسی چمڑے میں پھر وہ آگ میں ڈال دیا جائے تو نہ جلے گا۔''

یہ حدیث سنن دارمی میں ہے۔ سنن دارمی حدیث کی گیارہ مشہور کتابوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ یہ صحاحِ ستہ میں شامل نہیں تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ امام ابن حجر عسقلانی ؒ سنن دارمی کو سنن ابن ماجہ پر فوقیت دیتے ہیں' جبکہ ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت عقبہ بن عامر ؓ جہنی ہیں۔ مدینہ میں آ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا' پھر مدینہ میں ہی مقیم ہو گئے۔ انہیں قرآن وحدیث اور فقہ کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ حضرت عقبہ بن عامر ؓ نامور تیر انداز اور ماہر فنونِ جنگ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی محفل میں ہمیشہ حاضر رہنے کی کوشش کرتے۔ کتب حدیث میں آپؓ کی ۵۵ مرویات ہیں۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں بے مثل و بے مثال ہے' اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت بے حد وحساب اور بے پایاں ہے اسی طرح کلام اللہ کی رفعتِ شان کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر قرآن مجید چمڑے کے اندر رکھا جائے اور پھر وہ چمڑا آگ میں ڈالا جائے تو آگ اُس کو نہیں جلائے گی''۔ گویا قرآن مجید کی برکت سے چمڑا نہیں جلے گا اور قرآن مجید بھی محفوظ رہے گا۔ یہ قرآن مجید کی معجزانہ شان ہے اور معجزہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت رسول اللہ ﷺ کے حین حیات تھی۔ اگرچہ اب بھی کئی دفعہ سننے میں آیا ہے کہ کسی جگہ آگ لگ گئی اور چمڑے کی جلد میں موجود قرآن مجید وہاں محفوظ رہا۔

شارحینِ حدیث کے مطابق اس حدیث میں چمڑے سے مراد انسان کی کھال ہے اور آگ سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ چنانچہ حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جس جسمِ انسانی کے اندر قرآن مجید محفوظ ہو اُس جسم کو دوزخ کی آگ نہیں جلائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اقرار اُخروی نجات کا ذریعہ ہے اور ''لا الٰہ الا اللہ'' قرآن مجید کا حصہ ہے تو پھر پورا قرآن تو لازماً نجات کا ذریعہ بنے گا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ روزہ اور قرآن بندے کی سفارش کریں گے اور ان دونوں کی سفارش قبول کی

جائے گی۔

جس شخص نے سالہا سال محنت کر کے اُس کلام کو اپنے سینے میں اتار لیا' جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا تھا تو اس کی فضیلت کا کیا حال ہوگا! عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صاحبِ قرآن (حافظ) سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ قرآن مجید پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا' پس تیرا مقام وہی ہے جہاں تو آخری آیت پر پہنچے۔'' (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھے اس کے لیے اس حرف کے بدلے ایک نیکی ہے اور ایک نیکی کا اجر دس نیکیوں کے برابر ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے' بلکہ الف ایک حرف ہے' لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف''۔ گویا الٓمٓ پڑھنے والے کو تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ حافظ قرآن حفظ کرتے ہوئے قرآن کی آیات کو بار بار پڑھتا ہے اور نیکیاں حاصل کرتا ہے۔ حفظ کے دوران حافظ دہرا دہرا کر اس قدر قرآن پڑھ لیتا ہے جتنا غیر حافظ تقریباً ساری عمر میں پڑھتا ہے۔ پھر حافظ زندگی بھر چلتے پھرتے قرآنی آیات کی تلاوت کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق اسے ہر حرف پر نیکی ملتی ہے۔ اندازہ کیجیے وہ تلاوتِ قرآن کے ذریعے زندگی بھر کتنی نیکیاں کما لیتا ہے!

قرآن مجید ایک ضخیم کتاب ہے اور اسے زیر زبر کی رعایت کے ساتھ یاد کرنا اور پھر اسے یاد رکھنا بظاہر ایک مشکل کام معلوم ہوتا ہے' مگر اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اسے آسان کر دیا ہے۔ چھوٹی عمر کے بچے کو حفظ قرآن پر لگا دیا جاتا ہے تو وہ دو تین سال میں پورا قرآن حفظ کر لیتا ہے۔ اپنے اردگرد میں دیکھیے کتنے ہی بچے ہیں جو حافظ ہیں! اگر حفظ قرآن مشکل ہوتا تو بچے کیا بڑے بھی اس کو حفظ نہ کر سکتے' مگر ایسا نہیں ہے' ہمارے معاشرے میں ہزاروں کی تعداد میں بچے' بوڑھے اور جوان حافظ قرآن موجود ہیں۔

حضرت سعید بن سلیم رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ''قیامت کے دن اللہ کے کلام سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہوگا' نہ کوئی نبی' نہ کوئی فرشتہ اور نہ کوئی اور۔'' (فضائل اعمال' باب فضائلِ قرآن)

حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید وہ سفارش کرنے والا ہوگا کہ اس کی سفارش رد نہیں کی جائے گی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن مجید ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت مقبول ہے اور ایسا جھگڑالو ہے کہ جس کا جھگڑا تسلیم کر لیا گیا ہے''۔ (ابن حبان)

سورۃ الملک کے فضائل میں منقول ہے کہ اس نے ایک بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کی تو وہ بخش دیا گیا۔ (مسند احمد۔ جامع ترمذی)' جبکہ حافظ تو وہ ہے جسے صرف سورۃ الملک نہیں بلکہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں یاد ہیں اور وہ اُن کی تلاوت کرتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ تمام آیات و سور کے فضائل سے مالا مال ہوتا رہتا ہے۔ حضرت معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی' اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو' پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود اس کا عامل

ہو''۔(مسند احمد' سنن ابوداؤد)

حافظ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے معانی اور مطالب سے آگاہ ہو اور اس کے احکام پر عمل پیرا بھی ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام سمجھا' حق تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس افراد کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمائیں گے جن کے لیے جہنم واجب ہو چکی ہو۔'' (ابن ماجہ' دارمی) یہ کتنا بڑا اعزاز ہے جو حافظ کو حاصل ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ مشرک اور کافر کو کسی طرح کی سفارش نفع نہ دے گی' کیونکہ ان کے بارے میں قرآن مجید میں فیصلہ ہو چکا کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

بہرحال حافظِ قرآن کو قرآن مجید کی حفاظت حاصل رہے گی۔ قرآن مجید کی برکات دنیا کی زندگی میں بھی اسے ملیں گی اور قبر اور حشر میں بھی قرآن مجید اس کے لیے سختیوں سے بچاؤ کا ذریعہ بنے گا۔ حافظِ قرآن کے لیے حفظِ قرآن بہت بڑا اعزاز ہے۔ وہ جب فوت ہوگا تو قرآن اپنے سینے میں محفوظ لے کر قبر میں جائے گا۔ قرآن کلامِ الٰہی ہے' وہ ضرور وہاں اس کا مونس و غم خوار ہوگا اور اس کے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہوگا۔ سورۃ التغابن میں قرآن مجید کو ''نور'' کہا گیا ہے۔ نور ایک خوبصورت لفظ ہے جو خوبی' اچھائی' خیر' عمدہ اخلاق اور حسن و جمال کے معنوں میں مجازاً استعمال ہوتا ہے مگر اس کا اصل معنی تو روشنی ہے۔ ظاہر ہے جو شخص پورا قرآن یعنی نور اپنے سینے میں لے کر قبر میں جائے گا تو وہاں اس کی قبر قرآن کے نور سے منور ہو جائے گی اور اسے کسی طرح کی ظلمت کا سامنا نہ کرنا پڑے گا اور پھر حشر کے روز بھی یہی قرآن اس کی نجات کا باعث بنے گا۔

بقیہ حواشی: شریعتِ اسلامی میں شراب نوشی کی سزا

---

(۸۰) سنن الترمذی' کتاب الحدود' باب ماجاء فی حد السکران۔

(۸۱) سنن ابی داؤد' کتاب الحدود' باب اذا تتابع فی شرب الخمر۔

(۸۲) مرقاۃ المفاتیح' ج۷' ص ۱۷۶۔

(۸۳) الھدایہ' المجلد الرابع' کتاب الحدود باب حد الشرب۔

(۸٤) الفقہ علی المذاھب الاربعۃ' ج٥' ص ۲٥'۲٦۔

(۸٥) سنن الترمذی' کتاب الحدود۔

(۸٦) حافظ ابن حجر نے ''التلخیص'' میں اس روایت کے متعلق لکھا ہے: ''لم یسبق ابن دحیۃ الی تصحیحہ'' نیل الاوطار' المجلد الرابع' الجزء السابع باب مقدار الجلد فی الخمر۔

(۸۷) کنز العمال' ج۳' ص ۱۰۰۔

(۸۸) کتاب الآثار' حدیث ۹۲۔

(۸۹) سنن الترمذی' کتاب الحدود' باب ما جاء فی حد السکران۔

(۹۰) صحیح مسلم' کتاب الحدود' باب حد الخمر۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الحدود' باب فی الحد فی الخمر

(۹۱) صحیح البخاری' کتاب الحد' باب الضرب بالجرید والنعال۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا تصوّرِ خلافت

تحریر: ڈاکٹر صہیب حسن (لندن)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ۱۹-۲۰ مارچ ۲۰۱۱ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ''ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی قرآنی' دینی اور ملی خدمات'' کے عنوان سے دو روزہ محاضراتِ قرآنی کا اہتمام کیا گیا۔ محاضرات کے دوسرے سیشن میں مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کے خلف الرشید ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ (چیئرمین القرآن سوسائٹی' لندن) نے ''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ خلافت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ مقالہ پڑھنے سے پیشتر موصوف نے چند منٹ کی تمہیدی گفتگو بھی فرمائی۔ یہ گراں قدر مقالہ تمہیدی گفتگو سمیت قارئین حکمت قرآن کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج)

جناب صدر مجلس اور معزز سامعین کرام!

میں یہ روایتی طور پر نہیں کہہ رہا' بلکہ میں واقعتاً ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کا بہت ہی شکر گزار اور ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ذی وقار سیمینار میں آنے کی دعوت دی اور مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی ملی' دینی اور قرآنی خدمات کے بارے میں انہیں خراج تحسین پیش کروں —— ایک کہاوت ہے کہ بچہ اپنے حال کے اندر جیتا ہے اور اپنے حال ہی میں مگن رہتا ہے' جوان مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے' جبکہ بوڑھا اپنے ماضی کے اندر جھانکتا ہے۔ تو آج مجھے بھی اپنے ماضی (قریب اور بعید) میں جھانکنے کی توفیق ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی سب سے بڑی پہچان تو رجوع الی القرآن کے حوالے سے ہے اور یہی میرا موضوع ہونا چاہیے تھا' لیکن میں نے آج اپنی گفتگو کے لیے ایک دوسرا موضوع ''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ خلافت'' اختیار کیا ہے۔ اس لیے میں ڈاکٹر صاحب کی تحریک رجوع الی القرآن کے بارے میں مختصر سی بات کہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس طرح قرآنی آیات اور قرآنی تنزیلات سے ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی کا تقابل پیش کیا ہے' وہ بہت ہی ممتاز چیز ہے۔ جب پاکستان کی عمر کے چالیس سال پورے ہوئے تو اس وقت انہوں نے ایک مضمون لکھا: ''پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال اور اس کی دینی و تاریخی اہمیت'' جس میں انہوں نے بنی اسرائیل اور پاکستان کے مسلمانوں کا آپس میں تقابل کیا اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے حوالے سے اس

آیت سے استشہاد کیا: ﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ (المائدۃ:۲۶) ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: اب یہ (ارضِ مقدس) حرام رہے گی ان پر چالیس سال تک' یہ بھٹکتے پھریں گے زمین میں''۔ بنی اسرائیل اپنی نافرمانیوں کے باعث چالیس سال تک ارضِ سینا میں صحرانوردی کے اندر مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا ان کے اوپر برستا رہا۔ صحرائے تیہہ میں چالیس سال تک بھٹکنے کے بعد بنی اسرائیل کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تھی۔ اس بنیاد پر محترم ڈاکٹر صاحب نے اُس وقت اس اُمید کا اظہار فرمایا تھا کہ کیا عجب کہ اب پاکستان بھی چالیس سال تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اپنے اصل مقصدِ قیام کی طرف رجوع کر لے — اور ع ''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!'' والا معاملہ بن جائے۔ لیکن ع ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' اسی طرح جب ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی اظہار احمد قریشی صاحب چالیس سال کے ہوئے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ایک کارڈ پیش کیا تھا' جس پر سورۃ الاحقاف کی یہ آیت تحریر کی تھی: ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً.....﴾ (آیت ۱۵) ''یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہوگئی.....'' اور بعد ازاں اسے میثاق میں بھی چوکھٹے میں شائع کیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں جبکہ انسان کی جوانی ایک خاص مرحلے پر پہنچ رہی ہوتی ہے اُس وقت انسان کی بصیرت کے اندر اضافہ ہوتا ہے اور انسان سنِ رُشد کو پہنچتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سورۃ الحدید کی روشنی میں جس انداز سے انسانی زندگی کے پانچ ادوار کا تقابل کیا ہے' وہ بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی اونچی چیز ہے۔ آپ نے سورۃ الحدید کی اس آیت:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰﴾

کے حوالے سے انسانی زندگی کے پانچ ادوار کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ کس طرح انسان کے بچپن' اس کی جوانی اور اس کے بڑھاپے پر منطبق ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں جس خوبصورت انداز میں کہی ہیں وہ پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے' دل میں بسانے کی چیز ہے۔ اس لیے کہ اس سے انسان کی دنیا سنورتی ہے' اسے اپنی آخرت کے بارے میں سوچنے کا احساس ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اس کی زندگی کے اندر انقلاب آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہی سب سے بڑا کمال ہے کہ انہوں نے سوتے دلوں کو بیدار کیا ہے اور مُردہ دلوں کے اندر زندگی کے شرارے بخشے ہیں۔ یہ ان کا اعجاز اور ان کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نُور سے بھرے۔ وہ شخص ایسے کام کر گیا جو بہت سے لوگ نہیں کر سکے۔

اسی طرح انہوں نے سورۃ النور کی آیت:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳۵﴾

کا جو کلائمکس قائم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نور جو کہ قلبِ مؤمن میں ہے' کا تذکرہ کیا ہے' وہ بھی ان کا اپنا منفرد اعجاز ہے۔

یہ سب باتیں میرے ماضی بعید کی ہیں جس وقت میں شروع میں ساہیوال میں ان کے ساتھ ان کے قائم کردہ قرآن ہاسٹل میں ٹھہرا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کی خدمات کی تفصیل تو بہت ہے مگر اب میں اپنے آج کے موضوع کی طرف آتا ہوں۔ میرا آج کا موضوع ہے:

''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصوّرِ خلافت''

مجھے لندن میں ایک طویل عرصہ کے قیام کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد مغفور و مرحوم کی احیاءِ خلافت' اقامتِ دین اور اصلاح وتجدید کی مساعی کا بھرپور علم ہونے کا دعویٰ تو نہیں ہے' لیکن ہر سال پاکستان کی ایک نہ ایک زیارت اور پھر ڈاکٹر صاحب کے افکار کے ترجمان تینوں جرائد (میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت) کا مسلسل مطالعہ' ڈاکٹر صاحب کی آمدِ لندن کے موقع پر ملاقاتیں' اُن کی جُہدِ مسلسل اور سعیٔ نا متزلزل' میرے علم وادراک سے پوشیدہ بھی نہیں رہیں' اس لیے ان سطور کو تحریر کرتے وقت میں بلا جھجک 'علیٰ بصیرہ' ہونے کا دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں۔ شروع ہی میں اس بات کو واضح کرتا چلوں کہ گو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے لیکچروں اور تحریروں میں کہیں کہیں سلطنتِ آلِ عثمان یا خلافتِ عثمانیہ کا ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے کبھی اُسے مسلمانوں کے لیے ماڈل قرار نہیں دیا' البتہ ۱۹۲۴ء میں سقوطِ دولتِ عثمانیہ کے بعد ہندوستان میں تحریک خلافت کا برپا ہونا اور بڑے بڑے عمائدینِ اسلام حتیٰ کہ مسٹر گاندھی کا بھی مسلمانوں کی آواز میں آواز ملانا' خلافت کی اس آخری نشانی سے حد درجہ تعلق کا غماز رہا تھا۔ اس لیے میں اس تحریر میں جہاں ڈاکٹر صاحب کے افکار بابت خلافت کا تذکرہ کروں گا وہاں خلافتِ عثمانیہ کے قریب ترین عملی ماڈل ہونے کی بنا پر دونوں کا تقابل بھی کرتا چلوں گا' چاہے وہ مثبت ہو یا منفی۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے دعوتِ دین کا عملی آغاز تو جمعیت طلبہ اور پھر جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے کیا' لیکن پھر جماعت سے علیحدہ ہونے' تنظیم اسلامی کی بنیاد رکھنے کے مراحل میں اُسی صور کو پھونکا کہ جس کی گونج بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال'، 'البلاغ' اور پھر 'حزب اللہ' کی صدائے ہشیار باش کی شکل میں بلند ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی فکر کے سوتوں کو ان تین ہستیوں (مولانا آزاد' ڈاکٹر اقبال اور مولانا مودودی) کے دامنِ فکر سے پھوٹتے دیکھا ہے' اس لیے بہتر ہوگا کہ پہلے خاص طور پر مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی آراء بابت خلافت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مولانا آزاد پہلے تو مسلمانوں کی قومی زندگی کے عروج وزوال کا گر بتاتے ہیں کہ اس کا اصل دور وہی تھا جب ان کی قومی وانفرادی' مادی ومعنوی' اعتقادی اور عملی زندگی پر اجتماع وائتلاف کی رحمت طاری تھی اور ان کے تنزل و ادبار کی اصل بنیاد اس دن پڑی جب ائتلاف واجتماع کی جگہ اشتات وانتشار کی نحوست چھانی شروع ہوگئی۔ پھر وہ نبی ﷺ کی ذات بابرکات میں اُن تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مجتمع مانتے ہیں کہ جس سے ایک حکومت کو بقا اور دوام حاصل ہوتا ہے وہ ان کی مختلف حیثیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کا پیغمبر تھا'

شریعت کا مقنّن تھا' امّت کا بانی تھا' ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا۔ وہ اگر پتّوں اور چھال سے پٹی ہوئی مسجد کے منبر پر وحی الٰہی کا ترجمان اور انسانی سعادت وہدایت کا واعظ تھا تو اسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کے لیے سپہ سالار لشکر بھی تھا۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھروں کا نظامِ معاشرت درست کرتا اور نکاح وطلاق کے قوانین نافذ کرتا اور اس کے ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا' غرضیکہ اس کی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے۔ اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔

پھر وہ لکھتے ہیں:

''جب آپ ﷺ دُنیا سے تشریف لے گئے تو خلفائے راشدین کی خلافت اِسی اجتماعِ قُویٰ ومناصب پر قائم ہوئی اور اسی لیے اس کو منہاجِ نبوت سے تعبیر کیا گیا' یعنی یہ نیابت ٹھیک ٹھیک' ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوّت کی سچّی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔ منصبِ نبوت مختلف اجزائے نظر وعمل سے مرکب ہے' ازاں جملہ ایک جزو' وحی وتنزیل کا موردِ ہونا اور شریعت میں تشریع وتأسیسِ قوانین کا اختیار رکھنا ہے' یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسئولانہ قوت' اس جزء کے اعتبار سے نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کے لیے شریعت وقانون کے وضع وقیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا''۔ (قرآن کا قانون عروج وزوال' ص ۶۰۔۶۱)

اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ میں سوائے وحی وتشریع کی نیابت کے باقی تمام امور کی نیابت حاصل تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ'' جس طرح داعی اسلام کا وجود' نبوت کے ساتھ خلافتِ ارض' حکومت وسلطنت' نظام وقوامِ سیاست' قیادتِ فوج وحرب' فتح وعمرانِ ریاست' مجالسِ شوریٰ وغیرہ' جہاں بانی وحکمران کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا ہے' اسی طرح خلافتِ خاصّہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری وعملی قوتوں اور تمام منصوبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحبِ امامت وخلافت بھی تھے' صاحب اجتہاد وقضا بھی تھے اور صاحب سیاست ونظم وحکامِ بلاد بھی' اصلاً ''امامتِ کبریٰ'' کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی دونوں سے مرکب ہے۔ اس لیے ان کی امامت میں دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی ہیں''۔ (ص ۶۲)

اور پھر اجتماع وائتلاف کی یہ حالت' بقول مولانا آزاد' حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگئی' قوتوں کا انتشار شروع ہو گیا اور اس کی تفصیل وہ یوں بتاتے ہیں:'' حکومت وفرمانروائی کا ٹکڑا الگ ہو کر مجرد شاہی کی شکل میں آ گیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا: **الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم مُلك**۔ سو واقعی اس کے بعد صرف پادشاہی ہی رہ گئی' اجتہاد اور قضاءِ شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین وفقہاء کی ایک جماعت پیدا ہوگئی' انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم وتربیتِ روحانی کے کاروبار سے نظامِ حکومت بالکل الگ ہو گیا''۔ (ص ۶۳)

مولانا آزاد بیعتِ خلافت اور بیعتِ ارشاد کا مسئلہ بھی چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں' وہ کہتے ہیں:'' پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی' اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کے لیے اور فقہاء کا مجرد استنباطِ

احکام ومسائل رہ گئے تو تزکیۂ نفوس اور ارشادِ قلوب کے لیے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی' جو بیعتِ توبہ وارشاد ہوئی اور اس طرح اصحابِ طریقت وتصوّف کی بنیاد پڑی۔'' (ص ۶۵)

ڈاکٹر اسرار احمد نے یہاں اس بات کا اضافہ کیا کہ اصل بیعت تو بیعتِ خلافت ہی ہے' جو ایک مخصوص علاقے میں حکمرانی کے منصب پر فائز ہوتا ہے' لیکن اگر ایسی خلافت موجود نہ ہو تو خلافتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے جو بھی جماعت آگے بڑھے اُس کا نظم بھی امیر جماعت کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر قائم ہوگا' لیکن چونکہ یہ ایک نظریاتی بیعت ہے' اس لیے وہ اختلاف یا عدمِ امتزاج کی صورت میں اس بیعت کو فسخ کر سکتا ہے۔ وہ مولانا مودودی کے اس نظریہ سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ارکانِ جماعت' دستورِ جماعت سے حلفِ پاسداری اُٹھالیں تو وہ بھی بیعت ہی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی سے وابستگی کے دوران تو اس شکل پر قانع رہے لیکن ''تنظیم اسلامی'' کے لیے انہوں نے طریقِ بیعت ہی کو ترجیح دی۔

مولانا آزاد اپنی کتاب ''ہجر ووصال'' میں حدیث ''خیر القرون'' کا خلافت کی مدت تیس سال ہونے سے اس طرح ربط قائم کرتے ہیں کہ گو محدثین نے قرن کے مفہوم کے تعیّن میں اختلاف کیا ہے لیکن چونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے (الخلافة بعدی ثلاثون سنة) کہہ کر تیس سال کی مدت کا تعیّن کر دیا ہے اس لیے یقیناً اس حدیث میں قرن سے مراد دس برس کا زمانہ ہے اور مقصود یہ ہے کہ بہترین دہ سالہ دور آنحضرت ﷺ کا تھا' اس کے بعد دوسرا عشرہ اور اس کے بعد تیسرا' جس کے بقیہ چھ مہینے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے پورے ہو گئے اور پھر زمانہ شر وفتن کا شروع ہو گیا۔'' (ص ۳۳۳) لیکن مولانا آزاد کی یہ توجیہہ اسی وقت خلافت راشدہ پر صادق آسکتی ہے جبکہ آنحضور ﷺ کے دہ سالہ دور کو بطور ماڈل شمار کیا جائے اور خلافت کے پہلے دو عشروں کو اصلاً اور آخری عشرہ کو تبعاً خلافت کا حصہ شمار کر کے تیس سال کی مدت پوری کی جائے' کیونکہ حدیث میں (خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهُم) کے مطابق آنحضور ﷺ کے قرن کے بعد صرف دو اور قرون کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن کی مدت بیس سال بنے گی نہ کہ تیس سال۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ قرن اوّل سے مراد عہدِ نبوت وصحابہؓ' قرنِ ثانی سے تابعین اور قرنِ ثالث سے تبع تابعین کا زمانہ مراد لیا جائے کہ قرونِ ثلاثہ میں مجموعی طور پر خیر کا غلبہ تھا اور شر مغلوب تھا۔

خلافت اور ملوکیت کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب جن چند احادیث کا اکثر ذکر کرتے ہیں اُن کی طرف مولانا آزاد بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''چنانچہ خیر القرون والی حدیث کے مطالعہ کے بعد اس حدیث کو دیکھئے جس کو صاحبِ مشکوٰۃ نے ''باب الانذار والتحذیر'' کی تیسری فصل میں درج کیا ہے:

عن ابن بشیر عن حذیفة قال: قال ﷺ : تکون النبوة فیکم ما شاء اللّٰه ثم تکون خلافةً علی منهاج النبوة ماشاء اللّٰه ان تکون ثم یرفعُها اللّٰه ثم تکون ملکاً جبریةً فیکون ماشاء اللّٰه ان یکون ثم تکون خلافةً علی منهاج النبوة۔

قال حبیبٌ فلما قام عمر بن عبد العزیز کتبتُ الیه بهذا الحدیث اذکّره ایاه وقلت أرجو

أن تكونَ امير المؤمنينَ بعد المُلك العاضّ والجبرية

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب تک اللہ کو منظور ہے تم میں وجودِ نبوّت باقی رہے گا۔ اس کے بعد منہاج نبوت پر خلافت قائم ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا قائم رہے گی اور پھر اُٹھالی جائے گی اور اس کے بعد جور وظلم کی بادشاہت شروع ہوگی اور جب تک منظورِ الٰہی ہے' رہے گی۔ اس کے بعد محض جبر و تسلّط کی حکومت ہوگی اور وہ بھی مشیتِ الٰہی کے مطابق رہے گی' لیکن اس کے بعد پھر ایک دور خلافتِ نبوت کے دور کا آئے گا۔

حبیب کہتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز تختِ خلافت پر بیٹھے تو میں نے یہ حدیث اُن کو لکھ کر بھیجی کہ مجھے امید ہے کہ آپ اس حدیث کی خبر کے مطابق ملک غضوض اور جبر کے بعد محض بادشاہ ہی نہیں بلکہ امیر المؤمنین ہوں گے۔" (ص ۳۳۵)

غالباً کاتبِ مقال خلافت علی منہاج النبوۃ کے بعد عربی نص میں "ملکاً عاضاً" لکھنے سے رہ گئے ہیں کیونکہ ترجمہ میں اسے "جور وظلم" کی بادشاہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گو ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کی صحیح لفظی ترجمانی کی ہے' یعنی "اسکے بعد کاٹ کھانے والی حکومت کا دور آئے گا"۔ مولانا آزاد اس کے بعد لکھتے ہیں:

"اس میں زمانے کی قید نہیں ہے۔ مگر ترمذی کی حدیث میں جس کو امام موصوف نے دوسری جلد کے باب الفتن میں درج کیا ہے' زیادہ تصریح ہے:

عن سعید بن جمهان قال ثنی سفینة قال: قال ﷺ الخلافة فی امتی ثلاثون سنةً ثم مُلك بعد ذالِكَ' ثم قال لی سفینة: أمسِك خلافة ابی بكر ثم قال: وخلافة عمر وخلافة عثمان ثم قال أمسِك خلافة علیّ' فوجدناها ثلاثین سنةً' قال سعید فقلت له: ان بنی امیّة یزعمون ان الخلافة فیهم' قال: كذبوا بنوا الزرقاء بل هم الملوك من شرّ الملوك

"سعید سے روایت ہے کہ سفینہ نے آنحضرت ﷺ کے اس قول کو روایت کیا کہ خلافت میری امت میں صرف تیس سال رہے گی' پھر اس کے بعد محض حکومت و بادشاہت ہے۔ اس کے بعد سعید کہتے ہیں کہ مجھے سفینہ نے کہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت شمار کرو۔ پھر کہا کہ حضرت عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کا عہد خلافت شمار کرو۔ میں نے سب کو جمع کیا تو کُل تیس سال ہوئے' پھر میں نے کہا' یہ تو سچ ہے لیکن بنو امیہ جو سمجھتے ہیں کہ ہم بھی خلیفہ ہیں یہ کیسی بات ہے' حالانکہ بموجب اس حدیث اور تمہاری بیان کردہ تطبیق کے' خلافت قبل از بنی امیہ ختم ہوگئی؟ اس پر سفینہ نے کہا کہ زرقاء کی اولاد (بنوامیہ) نے کذب بیانی کی' وہ خلیفہ کہاں ہیں' وہ تو شریرترین بادشاہوں میں سے بادشاہ ہیں۔" (ص ۳۳۶)

ڈاکٹر اسرار احمد نے خلافت راشدہ کے بعد ان دو ادوار کی کھل کر نشاندہی کی ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ بعد کی حکومتیں ایسی "مُلک عضوض" کاٹ کھانے والی حکومتوں کے ضمن میں آتی ہیں اور یہ سلسلہ یورپین اقوام کے مسلم ممالک پر غلبہ استعمار تک چلتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر جبر کا دور شروع ہوتا ہے اور آزادی کے بعد بھی قبائے جمہوریت میں استبدادی قوتیں' ڈکٹیٹرشپ اور شخصی حکومتوں کا جبر قائم ہے' اور اس کا اظہار عوام کے اُس

غیظ وغضب سے ہو رہا ہے جس کی لپیٹ میں تونس اور مصر کے جابرانہ نظام کی بساط پلٹنے کے بعد کئی دوسرے عرب ممالک جیسے لیبیا، یمن، بحرین اور عُمان اور کسی حد تک اُردن بھی آ چکے ہیں۔

سلطنتِ عثمانیہ کی ابتدا تو ایک تُرک سردار عثمان بک کے ہاتھ پر ۲۷ جنوری ۱۳۰۰ء (۴ جمادی الاولیٰ ۶۹۹ھ) میں ہوئی تھی جو موجودہ ترکی کے شہر اسکی شہر اور اس کے نواح پر مشتمل تھی، لیکن پھر وہ وسعت پذیر ہوتی رہی۔ ساتواں سلطان محمد الفاتح ۱۲ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ (۲۹ مارچ ۱۴۵۳ء) کو قسطنطنیہ فتح کر کے آنحضور ﷺ کی اس حدیث کا مصداق ٹھہرا جس میں اس شہر کے فاتح کو ''نِعم الأمیر'' (کیا ہی بہترین امیر) اور اس کے لشکر کو (نِعمَ الجیش) بہترین لشکر قرار دیا تھا، لیکن پھر نویں سلطان یاووز سلیم نے جب ۹۲۳ھ (۱۵۱۷م) میں مصر فتح کر لیا اور خلافت عباسیہ کے آخری خلیفہ المتوکل علی اللہ کو اپنے ساتھ استانبول (قسطنطنیہ) لے آیا تو علماء ومفتیان کی موجودگی میں جامع ایا صوفیہ میں وہ تاریخی تقریب منعقد ہوئی جس میں خرقہ خلافت سلطان یاووز سلیم کو پہنا دیا گیا۔ وہ اس اعتبار سے بھی خلافت کا مستحق ٹھہرا کہ اب ارضِ حجاز (مکّہ اور مدینہ) بھی اس سلطنت کے ماتحت آ چکے تھے۔

''**الدولة العثمانیه المجهوله**'' کے مصنفین لکھتے ہیں: ''یہاں ہمیں یہ بات یاد آتی ہے کہ عبدالرحمٰن الداخل جس نے اندلس میں اموی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی، اپنے لیے خلیفہ کا لقب اختیار کرنے میں ہچکچاتا رہا کیونکہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ خلافت ایک ہی ہو سکتی ہے، ایک سے زائد نہیں، اور خلیفہ شرعی کے لیے حَرمَین شریفین کا حامی ہونا ضروری ہے، جو کہ اُس وقت عباسی خلیفہ کو حاصل تھی۔ لیکن پھر عبدالرحمٰن ثالث کے دور میں اموی خلافت کا بھی اعلان کر دیا گیا حالانکہ وہ حَرمَین شریفین پر کنٹرول نہ رکھتا تھا، اور یوں فاطمی خلافت کو شمار کرتے ہوئے تین خلافتیں ایک وقت میں جمع ہو گئیں۔''

اسی کتاب کے مؤلّف خلافت کی نوعیّت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''خلافت کا مقام دراصل رسول ﷺ کی اتباع کا مقام ہے، اور اس کا کما حقہٗ حق بعد کے ادوار میں نہیں کیا گیا۔ اس لیے بعض محققین خلافت کی دو قسمیں کرتے ہیں۔ پہلی حقیقی یا کامل خلافت جس میں خلافت کی ساری شرائط مجتمع ہوں، اور جو کہ اس انتخاب کے نتیجے میں قائم ہوتی ہے جو مسلمانوں کی باہمی رضامندی اور بیعت کے اصول پر وجود میں آتی ہے۔ ترکی کے سب بڑے فقیہہ ''صدر الشریعہ'' اس خلافت کو خلافت نبوت سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری شکلی یا صوری خلافت، یعنی وہ امامت جو ضروری شرائط پر پوری نہ اترتی ہو یا وہ حکومت جو بذریعہ انتخاب اور بیعت سے وجود پذیر نہ ہوئی ہو بلکہ جبر واکراہ اور زبردستی تسلّط کے نتیجے میں قائم ہوئی ہو، ایسی حکومت میں ''سلطنت'' کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور رسول ﷺ فرما گئے ہیں: **الخلافة من بعدی ثلاثون عاماًثم یکون حکمًا عضوضًا** اور فقہاء کے اتفاق کے مطابق حقیقی خلافت کا دور خلفاء راشدین بشمول سیدنا الحسنؓ کے گزر گیا اور اس کے بعد اُموی اور عباسی دور دوسری قسم خلافت کا تھا۔ سلاطین بنی عثمان کو بھی علی الاقل دوسری قسم میں شامل کیا جانا چاہیے، ان کی خلافت ہر صورت صلاحیتوں (بمعنی حقوق) اور ذمہ داریوں سے خالی نہیں تھی بلکہ تمام سلاطین خلفاء تھے، حقوق اور ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔''

دسویں سلطان، سلیمان القانونی کے القاب ملاحظہ ہوں جو فقیہہ ابوالسعود آفندی نے سلطان کے وضع کردہ

کتاب قانون کے دیباچہ میں لکھے ہیں:

"السلطان ابن السلطان'السلطان سليمان خان ابن السلطان سليم خان'خليفة رسول ربّ العالمين' مِمهّد قوانين الشرع المبين'وظلّ اللّٰه الظليل على كافة الأمم' حائز الامامة العظمىٰ' وسلطان البحر' وارث الخلافة الكبرىٰ كابرا عن كابر' ناشر القوانين السلطانيه والخاقان العاشر' سلطان العرب والعجم والروم' حامى حمى الحرمين المحترمَين والمقامَين المعظّمين المفخّمين"

ڈاکٹر اسرار احمد دورِ ملوکیت کے سلاطین وخلفاء اور موجودہ دور کی آمرانہ اور استبدادی حکومتوں پر نیش زنی کرنے کے ساتھ ساتھ اُن اچھے اقدامات کو سراہنے میں بخل سے کام نہیں لیتے جو ان حکومتوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے' جیسے پاکستان میں قراردادِ مقاصد کا پاس ہونا' قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جانا' یا سعودی عرب میں بدعات کا قلع قمع کیا جانا اور کتاب وسنّت کی ترویج میں جرأت مندانہ کارنامے انجام دینا۔ البتہ ہمیں مولانا آزاد کے اس تجزیے سے اتفاق نہیں جو سلطان عبدالحمید خان سے متعلق ہے۔ وہ ''قرآن کا قانونِ عروج وزوال'' میں لکھتے ہیں: ''البتہ جو انقلاب سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطینِ عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی وشخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہوگئی' سو بلا شبہ خلافتِ راشدہ کی طرف عود ورجعت کا یہ ایک مبارک اقدام تھا جس کے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔'' (ص ۲۵) یہ درست ہے کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے دور میں سیاسی حالات سے مجبور ہوکر دستور وضع کیا کہ جسے مفر الآلوسی (۱۸۵۳ء) اور مشہور صوفی شیخ سعید النورسی کی حمایت حاصل رہی لیکن اُسے شریعت کے منافی بھی قرار دیا گیا اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس میں غیر مسلموں کو بھی نمائندگی دی گئی تھی' اور انہی غیر مسلم عناصر کے اصرار پر مملکت رُوس کے ساتھ دولت عثمانیہ کو جنگ میں جھونک دیا گیا اور ہزیمت پر ہزیمت اٹھانا پڑی' بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سلطان عبدالحمید کا تینتیس سالہ دور اُس کے اپنے شخصی اور تحکمانہ اسلوب کی بنا پر کامیاب رہا ورنہ جمہوریت کی گردان کرنے والے اس کے وزراء (بشمول مدحت پاشا جو کہ صدرِ اعظم کہلاتے تھے) بہت پہلے اُس کی بساطِ حکومت لپیٹ چکے ہوتے اور سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ۱۹۲۴ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یہ سلطان عبدالحمید ہی تھا جس نے تھیوڈر ہرٹزل (۱۸۶۰۔۱۹۰۴) کی فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں ایک بڑی مالی پیشکش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا: ''میں سرزمینِ فلسطین کی بالشت برابر زمین بھی نہیں بیچوں گا' یہ وطن میری ملکیت نہیں بلکہ تمام اُمتِ عثمانیہ کا ہے۔ اُمت نے یہ زمین اپنا خون دے کر حاصل کی ہے اور ہم اُسے بغیر خون کے واپس نہیں کریں گے۔''

اور پھر جونہی مدحت پاشا کی ''الاتحاد والترقی'' کے نام سے ۱۸۹۰ء میں پارٹی قائم ہوئی' فلسطین کے موضوع پر ڈھیل دینے کا آغاز ہوگیا۔ یہ پارٹی' فرانسیسی انقلابیوں کے تین نعروں (شعار) کی حامل تھی' یعنی حریّت' انصاف' مساوات واخوت۔

یہاں میں ڈاکٹر اسرار احمد کی بصیرت کی داد دوں گا کہ انہوں نے اپنے افکار میں دو باتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک یہ کہ مسلمان حکومت (اور یہاں مراد ہے پاکستان) کی پارلیمنٹ قانون سازی کا ادارہ ہے' اور قانون چونکہ شریعت اسلامیہ سے سرِمُو متجاوز نہیں ہوسکتا اس لیے وہاں غیر مسلم اعضاء کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ وہ بات ہے کہ جسے علماءِ عصر میں سے بہت کم لوگ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

دوسری بات کہ جس کے پیش کرنے والے صرف اور صرف ڈاکٹر اسرار احمد ہیں کہ پاکستان کی اراضی کی نوعیت اراضی خراج ہے یعنی یہ زمین مسلمانوں نے بزور بازو حاصل کی تھی اس لیے یہاں جاگیرداری کی کوئی گنجائش نہیں۔

سلطنتِ عثمانیہ میں تمام مفتوحہ علاقوں کو ''اراضی امیریہ'' سے تعبیر کیا گیا اور اس میں تصرف کے بارے میں آلِ عثمان نے مالکی مذہب کے قول کو اپنایا کہ جس کے مطابق اراضی مفتوحہ کی ملکیت حکومت کے ہاتھ میں رہتی ہے اور رعیت کو کچھ مالی معاوضے کی صورت میں حقِ انتفاع حاصل ہوتا ہے۔ گویا یہ اراضی مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کے لیے وقف ہیں۔ آلِ عثمان نے یہ نظام ''سلجوقی سلطنت'' سے وراثت میں پایا تھا جسے اُن کے ہاں ''اراضی مملکت'' یا ''اراضی سلطان'' یا ''حاصل کردہ اراضی'' کہا جاتا تھا۔ اس نظام سے نہ صرف مالی فوائد حاصل ہوئے بلکہ عسکری قوت بھی فراہم ہوئی۔ سلیمان قانونی کے دور میں شیخ ابوالسعود نے اراضی امیریہ کے لیے مفصل قوانین وضع کیے جو شریعت کی روشنی میں لکھے گئے۔ (ص ۵۸۶)

یعنی حکومت ان اراضی کو کسی کی شخصی ملکیت میں نہیں دے سکتی' کسی کو بطور جاگیر نہیں عطا کرسکتی بلکہ وقف کی طرح ضرورت مند لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن زمین میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد اس موضوع پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں' لیکن یہ عقدہ کھلا تو بہت بعد میں آکر کھلا' **فجزاہ اللّٰہ عن الاسلام والمسلمین خیرًا**۔

یہاں تک تو تذکرہ ہوگیا مولانا آزاد اور ڈاکٹر اسرار کے فکری تعلق کا' اب کچھ تذکرہ ہو جائے مولانا مودودی سے ڈاکٹر صاحب کے خوشہ چین ہونے کا۔

گو ڈاکٹر اسرار جمعیت اور جماعت کے تعلق سے عملی طور پر صرف پانچ سال مولانا کے ہم سفر رہے ہیں' وہ سحرِ مودودی سے کبھی نکل نہیں پائے۔ وہ اُن کے اس فکر کے پیغامبر ہیں جو انہوں نے تقسیم سے پہلے اُجاگر کیا تھا۔ اپنی کتاب ''تحریکِ جماعتِ اسلامی'' میں وہ مولانا مودودی کے افکار کو خوب شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ ہم صرف اُس کا خلاصہ بیان کرسکتے ہیں۔

انہوں نے قانونی اور حقیقی مسلمان کا فرق واضح کیا' ایک صرف کلمہ گو مسلمان جو زیادہ سے زیادہ نماز روزہ کا پابند اور دوسرا وہ جو کافرانہ نظام سے بغاوت کا اعلان کرتا ہو' انگریزوں کی فوج ہو یا نظام عدالت' وہ اس کی نوکری پر لعنت بھیجتا ہو۔ زیادہ سے زیادہ اُن شعبوں میں ملازمت کا جواز پیدا کیا جن سے مفادِ عامہ وابستہ ہو۔

انہوں نے بتایا کہ قومیں نسل ونسب کی بنا پر بنتی ہیں لیکن مسلمان ایک جماعت ہیں' حزب اللہ ہیں' اُمّتِ

مسلمہ ہیں۔ اُن کا وطن زمین کا ایک ٹکڑا نہیں بلکہ وہ آفاقی ہیں۔ وہ مسلم قوم پرستی کے نہیں بلکہ اسلام پرستی کے قائل تھے' ان کے نزدیک مسلمان کا اصل کام دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت دینا اور آخرت میں اللہ کی رضا کا حصول تھا' وہ قومی حکومت نہیں بلکہ اصولوں کی حکومت کے قائل تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد واضح کرتے ہیں کہ مولانا آزاد' مولانا مودودی' علامہ مشرقی اور خیری برادران سب ہی حکومتِ الٰہیہ کی اصطلاح پر اتفاق کرتے تھے' یہ مولانا امین احسن اصلاحی تھے جنہوں نے جماعت میں اقامتِ دین اور شہادت علی الناس کی اصطلاح کو رواج دیا۔

مولانا مودودی اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک صالح جماعت کا تصور رکھتے تھے' ایسی جماعت جو اپنے قول و فعل سے' اپنی دعوت و تبلیغ سے' اور اپنی جہدِ مسلسل سے عوام کے ذہنوں میں ایسا انقلاب برپا کر دے کہ وہ کافرانہ نظام کو گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی کی طرح ہضم نہ کر پائیں۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سیکولر جمہوریت پر مبنی کافرانہ نظام سے ایک اسلامی نظام جنم نہیں لے سکتا۔ وہ مسلم لیگ کے فکر سے اتفاق نہیں کرتے تھے کہ پہلے ایک قومی اسٹیٹ بنا لو اور اس کے بعد اُسے جو چاہو جامہ پہنا دو۔ ان کے نزدیک ایک کافرانہ نظام اسلامی حکومت کو جنم نہیں دے سکتا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا چاہتے تھے کہ سرزمین عرب میں جہاں ہر طرح کی بُرائیاں تھیں' مسائل تھے' آپ ﷺ نے صرف توحید باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی' اور اسی دعوت کے نتیجہ میں بالآخر ایک اسلامی اسٹیٹ بھی قائم ہوگئی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ جماعت نے تقسیم سے قبل اُمت کے دوسرے مسائل جیسے قضیہ فلسطین یا قیام پاکستان کی جدوجہد سے بے اعتنائی برتی' کیونکہ اصل کام تو اقامتِ دین اور لوگوں پر دین کا گواہ بننا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان بن بھی گیا تو ہمارا کام معاشرے میں بنیادی تبدیلی لانا ہوگی کہ جس کے نتیجے میں صالح قیادت وجود میں آئے گی۔ جماعت کے ارکان کو اپنے اس مقصد سے والہانہ لگاؤ تھا' جماعت میں داخل ہوتے وقت وہ اس طرح حلف اٹھاتے جیسے کوئی نومسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار صاحب تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد جماعت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں گاڑی کا رُخ ہوا کے رُخ کی مانند ہوگیا۔ مولانا نے مسلم قوم ہونے کا اعتراف کیا اور پھر اس بات کی طرف دعوت دی کہ جب یہاں مسلمان ہی مسلمان بستے ہیں تو یہاں اسلام ہی کا نفاذ ہونا چاہیے۔ انہوں نے جمہوریت کے مقابلہ میں ''تھیوڈیموکریسی'' کی اصطلاح دی اور پھر اس اصطلاح کی خوب پذیرائی بھی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب مولانا مودودی کے نقشِ اوّل کے امین تھے' اُسی کی دعوت دیتے تھے' اس لیے جماعت کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی زمین اور نیا آسمان برپا کیا۔ انہوں نے مولانا آزاد کی صدائے خلافت کو بازگشت عطا کی۔ آزاد کے ہاں تو صرف تصوّر ہی تصوّر تھا' ڈاکٹر اسرار احمد نے اُسے تحریک کا جامہ پہنایا اور پاکستان کے در و دیوار اس آواز سے گونج اُٹھے۔ انہوں نے خلافت کے ایک ایک جزء کو تفصیلاً بیان کیا' اُسے بال و پر عطا کیے' نظامِ خلافت کے نو نکات کو اہدافِ تنظیم میں شامل کیا۔

ڈاکٹر صاحب شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بڑے مدّاح ہیں لیکن اُن کا تذکرہ خال خال ملتا ہے۔ وہ اُن

کے اس قول ''فکّ کلّ نظام'' یعنی پہلے ہر نظام کو تحلیل کرو' کو بڑی اہمیت دیتے ہیں کہ جس طرح پہلے شرک کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں تو توحید کے لیے راستہ صاف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار' مولانا مودودی اور آزاد کی مانند انسان کو خلیفۃ اللہ مانتے ہیں' اور اس پر نکیر کرنے والوں کو بے اعتنائی سے دیکھتے ہیں' لیکن اصولی طور پر وہ خود بھی مانتے ہیں کہ گو انسان اللہ کا نائب ہے لیکن پاپائیت کی طرح وہ حقوقِ الٰہی کا مالک بن کر لوگوں کی گردنوں پر سوار نہیں ہوسکتا' بلکہ دراصل خلیفہ وقت لوگوں کی نیابت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے۔ ہمارا بھی یہی کہنا ہے کہ قرآن وحدیث میں کہیں خلیفۃ اللہ کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی' انسان کو صرف خلیفہ کہا گیا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾(البقرۃ:۳۰) اور ﴿یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾(ص:۲۶) خلیفہ' خَلَفَ سے نکلا ہے یعنی کسی کے بعد میں آنے والا۔ زمین میں انسان سے پہلے بھی کوئی مخلوق (جیسے جنات) آباد تھی' انسان اُن کے بعد آیا تو اُن کا خلیفہ ٹھہرا۔ اور اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ رسول اللہ کہا گیا' خلیفۃ اللہ نہیں۔ انسان کو خلیفہ اللہ کہنا اس اعتبار سے بھی صحیح نہیں کہ خلیفہ تو کسی غائب ہستی کی نیابت کرتا ہے' اور چونکہ اللہ تعالیٰ غیوبت سے پاک ہیں اس لیے دعاءِ سفر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ان الفاظ کے کہنے کی تلقین کرواتے ہیں: **اَللّٰھُمَّ انتَ الصَّاحِبُ فی السَّفر والخَلیفَة فی الأھل والمال والوَلد** ''اے اللہ' آپ ہی سفر میں ہمارے ساتھی ہیں اور اہل وعیال کے لیے بھی خلیفہ ہیں'' یعنی میں اُن سے غائب ہوں لیکن آپ اُن کے لیے ہر وقت حاضر ہیں کہ ان کی نگہداشت کرسکیں۔ اس بات کو امام ابن تیمیہؒ خوب وضاحت سے بیان کرچکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خلیفہ کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے Vicegerent کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں کہ سلطنت برطانیہ میں بادشاہ یا ملکہ تو انگلینڈ ہی میں قیام پذیر رہتا تھا لیکن ہندوستان میں اس کی طرف سے وائسرائے حکومت کیا کرتا تھا۔ یہ مثال اس لحاظ سے مناسب نہیں کہ ہندوستان یا برطانوی مقبوضات میں وائسرائے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ شاہِ انگلستان خود اتنی دُور سے وہاں کا نظم ونسق چلانے پر قادر نہیں تھا' لیکن خلافت کا مفہوم ابتلاء وآزمائش سے مرتبط ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْمَا اٰتٰىكُمْ﴾ (الانعام: ۱۶۵)

''وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فضیلت دی تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اُس میں تمہاری آزمائش کرے۔''

ڈاکٹر صاحب جمہوریت کے لیے عوامی حاکمیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک اسلامی اسٹیٹ میں حاکمیتِ الٰہی کا اقرار کرلیا جائے تو اُسے اسلامی جمہوریت کہا جاسکتا ہے کہ نمائندگی جمہور کا قاعدہ باقی رہے گا' لیکن دستور ساز اسمبلی قرآن وسُنّت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کرسکے گی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جب اسلام نے اپنے سیاسی نظام کے لیے ایک نام دیا ہے یعنی خلافت تو اُسے کیوں ترک کیا جائے؟

ڈاکٹر صاحب بالآخر اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ نام چاہے ملوکیت ہو یا جمہوریت' پارلیمنٹ کا ایک

ایوان ہو یا دو وحدانی نظام ہو یا وفاقی' اصل چیز شریعت کا نفاذ ہے' نظام عدل وقسط کو برپا کرنا ہے' مشورہ کے ساتھ حکومت کو چلانا ہے' اس لیے وہ پاکستان میں جمہوریت کو رواں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر قوم کا معتد بہ حصہ اسلام کے نفاذ کے لیے مخلص ہو تو ووٹوں کی بنا پر وہ یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ خود اس نظام کا حصہ بننا نہیں چاہتے' لیکن اسلام پسند جماعتوں کو اپنے ووٹ سے محروم کرنے کے بھی روادار نہیں۔ وہ خود اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اگر میرے ساتھ لوگوں کی اچھی بھلی تعداد کھڑی ہو جائے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ پاکستان میں مُنکر کو کیسے فروغ دیا جا سکتا ہے! وہ فراہمی قوت قابل قدر تعداد کی موجودگی سے قبل مسلّح تصادم کے حامی نہیں' بلکہ پُرامن احتجاج کے قائل ہیں کہ ع ''شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات!''

اس احتجاجی سیاست کے نتیجہ میں تیونس اور مصر کی آمرانہ قیادتیں گھر سے بے گھر ہو چکی ہیں اور ان سطور کی تحریر کے وقت لیبیا میں اس پُرامن تحریک احتجاج نے مسلح تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے جس کے نتیجہ میں خاصا خون خرابہ ہو چکا ہے' لیکن ایک حد تک ڈاکٹر اسرار احمد کے قول کی مصداقیت واضح ہو چکی ہے۔ رونا صرف اسی بات کا تو ہے کہ یہ سارا احتجاج مالی اور دُنیوی منفعت کی خاطر تو ہو رہا ہے لیکن کیا اسلام اور صرف اسلام کی خاطر بھی ہزاروں لاکھوں کا مجمع دھرنا دے سکے گا؟

ڈاکٹر صاحب نے حکومت اور ریاست کا فرق بھی بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ دولتِ عثمانیہ کے سقوط سے قبل گو مسلمانوں کی ایک سے زیادہ حکومتیں رہی ہیں لیکن انہیں اسلامی ریاست کے مختلف انتظامی یونٹوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' کیونکہ ایک مسلمان بغیر کسی پاسپورٹ یا ویزا کے کہیں بھی جا سکتا تھا' بلکہ ایک مسلم حکومت میں قاضی اور وزیر کا عہدہ بھی حاصل کر سکتا تھا۔

اب ہم خلافتِ اسلامیہ پر مبنی نظام حکومت کے خدوخال کا تذکرہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے تصورات اس نظام حکومت سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔

اس موضوع پر میرے علم کی حد تک سب سے بہترین کتاب' اُردن یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد عبد القادر ابوفارس کی ہے جس کا عنوان ہے ''النِظام السِیاسی فی الأسلام''۔ ہم پہلے اس کے بنیادی مباحث کے عنوانات کا تذکرہ کرتے چلیں تا کہ پھر اصل موضوع سے اسے مربوط کیا جا سکے۔

① اسلامی نظام کی چار بنیادیں:

۱۔ اللہ کی حاکمیت ۲۔ عدل اور مساوات ۳۔ اطاعتِ امیر ۴۔ شورائیت

② اہل شوریٰ کے اوصاف:

مکلّف ہونا (یعنی مسلمان' بالغ' عاقل)۔ آزاد ہونا۔ مرد ہونا۔ صاحب علم ہونا۔ وصف عدالت کا پایا جانا (یعنی فاسق نہ ہو)۔

اور مزید دو شرطیں جو مولانا مودودیؒ نے رقم کی ہیں: مسلم ملک کا شہری ہونا' امیدوار اپنے آپ کو نامزد نہ کرے۔

③ اصحاب شوریٰ کے اختیارات:

صدر حکومت کا انتخاب کرنا اور نااہلی کی بنا پر اُسے معزول کرنا۔

④ اسلامی حکومت بعہدِ نبوی کیسے قائم ہوئی؟

⑤ صدر اور گورنروں کو کن اوصاف کی بنا پر چُنا جائے؟

⑥ کیا متعدد اسلامی حکومتیں ہو سکتی ہیں؟

⑦ صدر مملکت کو کن القاب سے پکارا جائے؟

⑧ صدر حکومت میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟

یہاں اہل شوریٰ کی سات شرطوں کے علاوہ مزید یہ شروط بیان کی گئی ہیں: کفاءت (یعنی اس منصب کی اہلیت رکھنا)' جسمانی اعتبار سے صحیح وسلامت ہونا' قریش میں سے ہونا۔

اس آخری شرط کے بارے میں ابن خلدون نے لکھا ہے کہ چونکہ عرب میں قریش کی فضیلت کو تمام قبائل تسلیم کرتے تھے اس لیے وحدتِ امّت کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ شرط رکھی۔

سلاطین آلِ عثمان چونکہ قریشی نہ تھے اس لیے اُس دور کے فقہاء نے اس شرط کو یہ کہہ کر ساقط کر دیا کہ فی زمانہ ایسا کوئی قریشی موجود نہیں ہے جو طاقت اور عصبیت رکھتا ہو۔

صاحب کتاب نے اس شرط کو اس انداز میں لیا ہے کہ اگر امارت کے امیدوار باقی سارے اوصاف میں برابر برابر ہوں تو پھر ان میں سے قریشی کو فضیلت دی جائے۔

⑨ صدرِ ریاست کی ذمہ داریاں یا خلافت اسلامیہ کی پہچان۔

صاحبِ کتاب نے الماوردی الشافعی (ف ۴۵۰ھ) کے حوالہ سے ان دس ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) دینِ اِسلام کی حفاظت اور اس سے متعلق تمام امور کا انتظام' جیسے اقامت الصلاۃ' مساجد کی تعمیر' نظام زکوٰۃ' اسلامی تعلیم کے ادارے' اسلام کے بارے میں شبہات کا ازالہ۔

(۲) تمام تنازعات میں شریعت کے مطابق فیصلے کرنا۔

اور اس ضمن میں قاضیوں کا مقرر کرنا' عدالتوں کا قائم کرنا اور عدالت کے فیصلوں کو نافذ کرنا شامل ہے۔

(۳) ملک میں امن وامان کا قیام کہ لوگ چین کی نیند سوئیں اور بلا خوف وخطر سفر کر سکیں۔

(۴) حدود الٰہی کی تنفیذ تا کہ ملک سے جرائم کا قلع قمع ہو' اور اس ضمن میں شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جائے۔

(۵) ملک کا دفاعی نظام اتنا مضبوط ہو کہ دشمن مملکت اسلامیہ کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

(۶) اعداء اسلام سے جہاد کرتے رہنا تا کہ اللہ کا دین غالب ہو۔

(۷) زکوٰۃ' صدقات' عشور' خراج اور دوسرے واجبات کا جمع کرنا' یعنی بیت المال کا قیام۔

(۸) دولت کی منصفانہ تقسیم یعنی کفالتِ عامّہ کا نظام۔

(۹) صرف اہل افراد کو حکومت چلانے کی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔

(۱۰) صدر مملکت یا خلیفہ ہر کام کو اپنی نگرانی میں کرائے۔

صاحب ''العقد الفرید'' نے ایک اور ذمہ داری کا اضافہ کیا' یعنی:

(۱۱) ہر کام میں شریعت سے رہنمائی لی جائے اور اس کا التزام کیا جائے۔

اور بعض علماء کی طرف سے دو باتوں کا اضافہ کیا گیا کہ

(۱۲) علم کو پھیلایا جائے۔

(۱۳) رعیت کے ہر فرد کے لیے ایک خوشحال زندگی مہیا کی جائے۔

⑩ صدر ریاست یا خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو؟

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب دو مرحلوں پر ہوتا رہا ہے۔ بیعتِ خاصہ اور بیعتِ عامہ۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہاتھ پر بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں چند افراد نے کی تھی جن کا شمار اہلِ حل وعقد میں سے ہوتا ہے لیکن ان کی اس نامزدگی کو پھر مسجد نبوی میں عمومی پذیرائی حاصل ہوئی جسے بیعتِ عامہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اپنی وفات سے قبل حضرت عمر فاروق ؓ کی نامزدگی اُس وقت تمام وکمال کے مرحلہ تک پہنچی جب کھلے عام اُن کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت سے قبل چھ افراد کی کمیٹی خلیفہ کے انتخاب کے لیے نامزد کر دی تھی اور پھر اس کمیٹی کے فیصلہ کو حضرت عثمان غنی ؓ کی بیعتِ عامہ سے قبولیت کا درجہ حاصل ہوا۔ ان کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علی مرتضیٰ ؓ سے بیعت کے طالب ہوئے تو انہوں نے کہا کہ جب تک کھلے عام یہ بیعت نہ ہوگی وہ اس منصب کو قبول نہ کریں گے۔

عصرِ حاضر میں مؤلّفِ کتاب کے نزدیک ہر بڑے شہر میں اہلِ حل وعقد کی ایک مجلس ہونی چاہیے جو خلیفہ کے چناؤ کے بارے میں اپنی رائے پیش کر سکے اور ذرائع ابلاغ کی نئی اور تیز ترین سہولیات کے ہوتے ہوئے اب ایسا کرنا اور زیادہ قابل عمل ہو چکا ہے۔

یہاں ''ولایتِ عہد'' کا ذکر بھی کیا گیا ہے' یعنی ایک خلیفہ اپنی زندگی ہی میں ولی عہد کو نامزد کر دے۔ حضرت عمر ؓ کے اُسوہ کو دیکھتے ہوئے فقہاء نے اسے جائز ٹھہرایا ہے' لیکن ایسی کوئی بھی نامزدگی خلیفہ کے اصول (باپ' دادا) یا فروع (اولاد) کے لیے ناجائز قرار دی ہے' لیکن بعض فقہاء نے صلاحیت کی بنا پر اسے جائز بھی قرار دیا ہے اور یہی رائے بنی اُمیہ سے لے کر دولتِ عثمانیہ تک بالفعل قابل قبول رہی ہے' گو اس صورت میں جو کچھ خرابیاں جنم لیتی ہیں اُن کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

⑪ صدر حکومت کی معزولی۔

نااہلی کے علاوہ فسوق وفجور بھی اس کی معزولی کا سبب بن سکتا ہے' یہ اختیار اصحاب حلّ وعقد کو حاصل ہے۔ اور اگر اس کے لیے تلوار اٹھانی پڑے تو وہ بھی اٹھائی جا سکتی ہے' الّا یہ کہ ایک بڑے فتنہ کا خطرہ ہو۔

خلیفہ خود دستبردار ہو جائے تو ایسا بھی جائز ہے اور اس ضمن میں حضرت حسن ؓ اور معاویہ ثانی (ابن یزید) کی مثالیں دی گئی ہیں۔

عصرِ حاضر میں سول نافرمانی کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور صدر مملکت کے لیے مدّت کی تعیین بھی کی

جاسکتی ہے۔

⑫ بیعتِ خاصہ اور بیعتِ عامہ کی بحث۔ (جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے)

⑬ وزارت کی مختلف اشکال کا بیان کیا گیا ہے۔

یہ وہ تیرہ مباحث ہیں جو اس کتاب کے ۳۶۵ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں' اب ملاحظہ فرمائیں کہ ہمارے ممدوح ڈاکٹر صاحب نے ان موضوعات کے بارے میں کن کن آراء سے نوازا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت: ڈاکٹر صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا منطقی نتیجہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ قائم کی جائے جو کہ ایک نظریاتی ریاست ہوگی جس میں قرآن وسنت کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمانہ نبوت تک شخصی خلافت کا تصور تھا' یعنی نبی ہی صاحبِ امر ہوا کرتا تھا' جیسے داؤد اور سلیمان علیہما السلام اپنے وقت میں اور رسول اللہ ﷺ اپنے زمانہ میں۔ لیکن پھر اجتماعی خلافت کا تصور اُبھرا جس کا آغاز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت سے ہوتا ہے۔ دولتِ عثمانیہ کے ذی قدر سلطان محمد الفاتح نے بانگِ دھل کہا تھا:

''اس خاندان کا سب سے اعلیٰ وارفع مقصد اللہ تعالیٰ کے کلمہ کو بلند کرنا ہے۔''

اسلامی نظام کی باقی تین بنیادیں یعنی نظام عدل ومساوات کا قیام' امیر کی اطاعت اور شورائیت کے التزام پر ڈاکٹر صاحب پورا یقین رکھتے ہیں' نظام عدل کو وہ اسلامی نظام کا مرکزی خیال قرار دیتے ہیں اور مساوات کو معاشرتی نظام کی اساسِ اول کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں۔ اطاعت امیر پر وہ بے حد زور دیتے ہیں' لیکن اُسے قانون سے بالاتر تسلیم نہیں کرتے۔ اس کی حیثیت قانون کو نافذ کرنا ہے۔ اُسے شوریٰ کی رائے کا احترام کرنا چاہیے' لیکن وہ مولانا مودودی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اِسے ویٹو کا حق حاصل ہے' اُس کے ہاتھ باندھے ہوئے نہیں ہونے چاہئیں۔

(۲) اہلِ شوریٰ کے اوصاف: اہلِ شوریٰ کے اوصاف میں وہ اُن کا مسلمان ہونا لازمی قرار دیتے ہیں کہ شوریٰ یا پارلیمنٹ قانون ساز ادارہ ہے جو کہ قرآن وسنت کی روشنی میں قانون وضع کرنے کا پابند ہے تو پھر غیر مسلم ایسے ادارے کے رکن کیسے بن سکتے ہیں؟ خواتین کو وہ ستر وحجاب کی حدود کے ساتھ پارلیمنٹ میں شمولیت کے خلاف نہیں۔ البتہ وہ یہ کہتے ہیں کہ فیصلہ کن امور مَردوں کے ہاتھ ہی میں رہنا چاہئیں۔

دولتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے دور میں جب بالآخر پارلیمنٹ قائم ہوئی تو اس کے دوسو چالیس ارکان میں سے ساٹھ غیر مسلم تھے' جن کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ' روس کے ساتھ غیر ضروری جنگوں میں شامل ہو کر زوال پذیر ہوئی۔

ہالینڈ کے ایک ماہر قانون لکھتے ہیں کہ دولتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب میں اسلام سے لگاؤ شامل نہیں' بلکہ امورِ حکومت میں خواتین کی غیر ضروری مداخلت تھی۔

(۳) اصحابِ شوریٰ کے اختیارات: اصحابِ شوریٰ کے اختیارات پر ڈاکٹر صاحب نے زیادہ کلام نہیں کیا۔ البتہ وہ کارکنانِ اسلامی حکومت کے اوصاف کو قرآن کی متعدد آیات اور احادیث سے بیان کرتے رہے ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت بعہد نبوی کیسے قائم ہوئی؟ ڈاکٹر صاحب نے نبی ﷺ کے عملی اُسوۂ حسنہ ہی سے ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے قدرتی مراحل کا تذکرہ بار ہا کیا ہے' یعنی دعوت' ہجرت (جو کہ بدعملی اور غیر اسلامی افعال کو چھوڑنے سے بھی ہوسکتی ہے)' باطل کے ساتھ کشمکش اور جس کے نتیجے میں جاء الحق و زھق الباطل کی کیفیت نمودار ہوتی ہے' حق کا بول بالا ہوتا ہے اور حق ہی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

(۵) صدر حکومت اور گورنروں کو کن اوصاف کی بنا پر چنا جائے؟ ڈاکٹر صاحب صدر کے بلا واسطہ انتخاب کے قائل ہیں اور وہ امریکہ کے صدارتی نظام کو پارلیمانی طریق انتخاب سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ ووٹرز کے لیے وہ صرف مسلمان ہونا کافی قرار دیتے ہیں کہ ان میں تقویٰ یا عدم تقویٰ کی بنا پر تفریق نہیں کی جاسکتی۔ البتہ امیدوار مجلسِ شوریٰ یا صدارتِ عظمیٰ کے لیے کبائر سے اجتناب کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ووٹر کے لیے چالیس سال کی عمر کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس عمر میں انسان قرآن کی نص کے مطابق حقیقی رُشد (یعنی بصیرتِ تامّہ) کو حاصل کر لیتا ہے۔

امیر جماعت ہو یا خلیفہ وقت' اُسے بیعت کے ذریعہ اپنے منصب پر فائز ہونا چاہیے۔ بیعت کے ضمن میں وہ مولانا مودودی کی اس تقسیم سے موافقت کرتے ہیں کہ بیعت تین قسم کی ہوسکتی ہے:

(۱) کسی مخصوص امر پر بیعت لی جائے۔

(۲) خلیفہ وقت کے ہاتھ پر سمع وطاعت کی بیعت کی جائے۔ یہ وہ بیعت ہے کہ جو صرف ایک خلیفہ کے ہاتھ پر کی جاسکتی ہے۔

(۳) وہ جماعت جو اسلامی نظام کے لیے کوشاں ہو اُس کے امیر کے ہاتھ پر بھی بیعت کی جاسکتی ہے جسے دستوری بیعت بھی کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس تیسری قسم کو اپنی جماعت کے لیے بہتر خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ یہ بیعت' خلیفہ وقت کے ہاتھ پر بیعت جیسی نہیں ہے اس لیے بیعت کرنے والا' امیر سے ناموافقت کی بنا پر اُسے فسخ بھی کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک تحریر میں حزب التحریر اور اس کے بانی شیخ تقی الدین النبہانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں اُن کا یہ استدلال ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ وہ اپنی کتاب ''الشخصیة الاسلامیة'' میں لکھتے ہیں کہ اصول فقہ کے مطابق ''مالا یتمُّ الواجب الا به فھُوَ واجبٌ''یعنی اگر ایک واجب کے بروئے کار لانے کا انحصار کسی دوسری چیز پر ہو تو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے اور چونکہ نظام خلافت کا قائم کرنا واجب ہے' اس لیے ایک ایسی جماعت کا قیام بھی ضروری ہے جو اس واجب کو وجود میں لا سکے۔ البتہ یہاں امیر حزب التحریر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ اصل واجب تو دعوت الی اللہ ہے' اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اہل بننا ہے' اور اگر ایمان وعملِ صالح کی زندگی اختیار کی جائے' داعی الی اللہ کی نصرت کی جائے' اور اس تحریک میں جان و مال کا نذرانہ پیش کیا جائے' مخالفین دعوتِ اسلام کا صبر واستقلال کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ استخلاف بھی پورا ہوتا ہے جیسا کہ صحابہ کے حق میں پورا ہوا تھا' یعنی مسلمان کا ہدف اللہ تعالیٰ کا عبدِ حقیقی بننا اور اُس کے دین کی شہادت دینا ہو تو پھر خلافت بطور انعام حاصل ہوتی ہے۔

(۶) کیا متعدّد اسلامی حکومتیں قائم ہوسکتی ہیں؟ تاریخِ اسلام میں خلافت کا آغاز وحدتِ امّت کے تصوّر کے ساتھ ہوا تھا' اس لیے ایک وقت میں ایک خلیفہ ہی متصور ہوسکتا تھا' اور ایک سے زائد خلیفہ کے ہونے کی بزبانِ نبوی بھی حوصلہ شکنی کی گئی تھی' لیکن جب بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی اور اندلس میں بنی امیہ کے ایک امیر عبدالرحمٰن الداخل نے اپنی حکومت کو قائم کرلیا تو فقہاء نے دونوں حکومتوں کے درمیان جغرافیائی بعد کی بنا پر دو خلفاء کو تسلیم کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ریاست اور حکومت کے فرق کو ظاہر کر کے اس مسئلہ کی حدت کو کم کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ اس کا ایک دوسرا حل مسلمان حکومتوں کی کنفیڈریشن قائم کرنے سے بھی نکل سکتا ہے۔

(۷) صدرِ مملکت کو کن القاب سے پہچانا جائے؟ صاحبِ کتاب اس دفعہ کو علیحدہ سے بیان کر کے غیر ضروری طوالت کا شکار ہوئے ہیں' وہ خلیفہ کہلائے یا امام یا صدرِ مملکت' اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم کو نافذ کرے۔ داؤد علیہ السلام بادشاہ بھی ہیں اور خلیفہ وقت بھی' لیکن وہ حق کی سرفرازی اور عدل کی بالادستی کی بنا پر عنداللہ مقبول ہوئے' اس کے برعکس اسلامی تاریخ میں کتنے ہی خلفاء ہیں جو اپنے جور وظلم کی بنا پر اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ اُن کے حق میں کوئی ایک بھی کلمہ خیر کہنے والا نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب عصری حالات کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس موضوع کو زیادہ اہمیت دیتے نظر نہیں آتے' حاکم وقت صدر کہلائے یا خلیفہ' وہ ہر صورت اپنے عمل وکردار سے ہی پہچانا جائے گا۔

(۸) صدر میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جہاں کارکنانِ جماعت کے اوصاف تفصیل کے ساتھ تحریر کیے ہیں وہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صدر ہر لحاظ سے اُن سے فائق ہوگا' علم میں' کردار میں' معاملہ فہمی اور بصیرت میں' بلکہ وہ قرآن وحدیث سے اتنا باخبر ضرور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی جماعت کا امام بھی بن سکے۔

(۹) صدرِ ریاست کی ذمہ داریاں یا خلافت اسلامیہ کی پہچان: الماوردی کی تحریر کردہ دس خصوصیات میں سے چھ تو ڈاکٹر اسرار احمد کے تجویز کردہ نو نکات ''نظامِ خلافت'' میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا پہلا نکتہ زیادہ جاندار اور مقصدِ خلافت کا بھرپور آئینہ دار ہے' اور وہ ہے: نظام خلافت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کے اعلان واقرار اور قرآن وسُنّت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔

عورتوں کے حقوق وواجبات کے بارے میں دو نکات غالباً اسلامی ممالک میں تحریک آزادئ ونسواں کے پھیلاؤ اور پروپیگنڈے کے مقابلہ میں ضرورت کی بنا پر رکھے گئے ہیں وگرنہ ان کی جگہ حدودِ الٰہی کا نفاذ اور دفاعِ وطن کا تذکرہ زیادہ مناسب تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے مفصّل خطابات میں چند اور باتوں کو نظام خلافت کے ضمن میں شدّ ومدّ سے بیان کرتے رہے ہیں' یعنی نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا قیام۔ سود' شراب اور جوا کا انسداد۔ جاگیرداری کا خاتمہ' مخلوط معاشرے کا سدّباب۔

وہ مخلوط قومیت کی نفی کرتے ہیں اور غیر مسلموں کو اُن کے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی ضمانت دیتے ہوئے

اُن کے حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں۔

(۱۰) صدر ریاست یا خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو؟ اس موضوع پر پچھلے صفحات میں سیر حاصل بحث ہو چکی ہے' ڈاکٹر صاحب استبدادی حکومت یا موروثی سلطنت پر سخت نکیر کرتے ہیں۔ دولتِ عثمانیہ میں وراثتی سلطنت نے جن خرابیوں کو جنم دیا اُن میں سب سے بڑی خرابی ایک سلطان کا اپنے بھائیوں کا قتل کرنا تھا تاکہ وہ یا اُن کی اولاد تخت و تاج میں وراثت کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ محمد الفاتح کے عہد تک تو ولی عہد کے متعین کرنے کا دستور نہ تھا' اہلِ حل وعقد ہی نئے خلیفہ کا انتخاب کرتے تھے۔ لیکن محمد الفاتح کی طرف یہ قانون منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میرے بیٹوں میں سے جسے سلطنت حاصل ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ نظامِ عالم برقرار رکھنے کے لیے اپنے بھائیوں کو قتل کروادے' اکثر علماء نے اسے جائز ٹھہرایا ہے ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کروایا۔ سلطان محمد ثالث نے اپنے بیٹے محمود اور اُنیس بھائیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

دولتِ عثمانیہ کی طرف سے دفاع کرنے والوں نے مذکورہ واقعات کو بھائیوں یا بیٹوں کی طرف سے سلطان کے خلاف بغاوت کا شاخسانہ قرار دیا' لیکن اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں کہ بعض قتل کے واقعات ایسے بھی ہوئے جن کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔

(۱۱) صدر حکومت کی معزولی: اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اہل حل وعقد کو خلیفہ کی نااہلی کی بنا پر اُسے معزول کرنے کا اختیار ہے' لیکن عملی طور پر ایک طاقتور حکمران کے سامنے ان معدودے چند افراد کی بے بسی آڑے آتی ہے۔ صاحب کتاب ''السیاسة والاسلام'' سول نافرمانی کا نسخہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پُرامن احتجاج کا راستہ تجویز کیا ہے' لیکن وہ جمہوریت کی اس روایت کو زیادہ قابل عمل سمجھتے ہیں کہ حاکم کے لیے ایک متعینہ مدت مقرر ہو جس کے اختتام پر لازمی طور پر انتخاب عمل میں لایا جائے اور ایک صدر کو مدتِ صدارت دو مرتبہ پورا کرنے کے بعد منتخب کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(۱۲) بیعتِ خاصّہ اور بیعتِ عامّہ: اس موضوع پر پہلے سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے' ڈاکٹر صاحب نے مطلق بیعت کا ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل سے اس بات کی گنجائش پیدا ہوتی ہے کہ ہر علاقے کی مجالس حلّ وعقد (یا مشاورتی کمیٹیاں) اگر ایک سے زائد نام پیش کریں تو پھر انتخاب عام کے ذریعے صدر چنا جائے اور دستوری بیعت کی بنیاد پر منصب صدارت کا آغاز ہو۔

(۱۳) انواع وزارات کا ذکر: ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کو تناول نہیں فرمایا ہے۔ ہر ملک اپنی ضروریات کو دیکھ کر مختلف وزارتیں قائم کرتا ہے۔ اصل چیز اہل اور صاحبِ صلاحیت افراد کا انتخاب ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو اہل افراد کے سپرد کرو۔''

ان تیرہ نکات پر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کے تذکرہ کے بعد یہ بحث اختتام کو پہنچتی ہے' لیکن آخر میں ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تجویز کا ذکر بھی ہو جائے۔ وہ ایک مسلم ریاست میں فقہی اختلافات کا حل یوں تجویز کرتے ہیں کہ پرسنل لاء کی حد تک تمام مسالک کو تسلیم کیا جائے اور ملکی قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ وہ

مسلمانانِ ہند کو داد دیتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے سیکولرزم کو قبول نہیں کیا جو کہ ہندو قوم کی ذات پات کی تفریق کی بنا پر اپنی ضرورت تھی۔ مسلمانوں نے پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے احتجاج کا راستہ اختیار کیا اور وہ کسی حد تک اپنے مطالبات منظور کروانے میں کامیاب رہے۔

جہاں تک ایک مسلم ریاست میں فقہی اختلافات کی بنیاد پر مختلف مسالک کو قانوناً شخصی آزادی دینے کا سوال ہے تو عبادات، رسم و رواج کی حد تک تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جہاں عائلی نزاعات عدالتوں کے فیصلوں کے مرہون منت ہوں جیسے ولی کے بغیر نکاح کے جواز کا مسئلہ، بدعتی طلاق نافذ ہونے کا مسئلہ، طلاق کے بعد بچوں کی کفالت کا مسئلہ وغیرہ تو اس میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل، اور دیارِ غریب میں ''یورپین کونسل برائے فتویٰ اور تحقیق'' کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مختلف مسالک کے علماء مل بیٹھ کر، باہمی مشاورت کی بنیاد پر اور مصلحت عامہ کی خاطر کسی ایک ایسی رائے پر اتفاق کر سکتے ہیں جو مفادِ عامہ اور عصر حاضر کی ضروریات سے مطابقت رکھتی ہو اور اس طرح مسالک کے درمیان بھی مفاہمت اور یگانگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے اس قول کی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے'' یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ حقِ اجتہاد تو علماء کی کونسل ہی کے سپرد ہوگا لیکن پارلیمنٹ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ کس کے اجتہاد کو نافذ کرے۔ اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے سلاطین آلِ عثمان کے اس طرزِ عمل سے کہ گو انہوں نے عموماً حنفی فقہ کے مطابق قاضیوں کو فیصلہ کرنے کا حق دیا لیکن چند بڑے مسائل میں جن میں اراضی مفتوحہ کو خراجی قرار دے کر حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا تھا، مالکی مذہب کی رائے کو اپنایا۔ یہی طرزِ عمل مسئلہ مزارعت، بیع مؤجل اور طلاق ثلاثہ فی مجلس واحد اور کئی دیگر مسائل پر بھی اپنایا جا سکتا ہے جس کی طرف ڈاکٹر صاحب نے بارہا توجہ دلائی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ وہ خوش بخت اور خوش قسمت شخص تھے جنہوں نے اپنی زندگی کو بامقصد گزارا، رجوع الی القرآن کی آواز کو ایک تحریک میں تبدیل کر دیا، نظام خلافت کے احیا کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ جس مشن کو انہوں نے ساری عمر حرزِ جان بنا کر رکھا تھا، اُسے آگے بڑھانے کے لیے نہ صرف اپنی صلبی اولاد بلکہ معنوی اولاد پر مشتمل ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جو اسلامیانِ پاکستان کے لیے ایک مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے اخلاف کو حسن عقیدہ اور حسن عمل کی دولت سے مالا مال رکھے، اُن کی کوششوں کو تمغۂ قبولیت سے نوازے اور اخلاص پر مبنی ہر جد و جہد کو اُن کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔

وما توفیقی الا باللّٰہ ' و آخر دعوانا اَنِ الحمدُ للّٰہ ربّ العالمین۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات اور مسلکِ اعتدال

پروفیسر عبدالماجد ☆ ڈاکٹر ایاز خان ☆☆

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات کو درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) تطبیق بین الفقہ والحدیث
(۲) اجتہاد و تقلید میں نقطۂ اعتدال
(۳) تقلید کی جائز اور فطری شکل اور قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا طرزِ عمل
(۴) مذاہبِ اربعہ کی خصوصیت اور حق پر ہونا اور ان کی تقلید کے بارے میں شاہ صاحب کی تحقیق
(۵) کیا شاہ ولی اللہ حنفی تھے یا اہلِ حدیث؟
(۶) تحقیقی قول پر عمل کرنے کے متعلق شاہ صاحب کی وصیت
(۷) اختلافی مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ کا طرزِ عمل

(۱) تطبیق بین الفقہ والحدیث

عرصہ دراز سے عالم اسلام کے بہت سے علمی اور تصنیفی حلقوں میں فقہ و حدیث کے دو متوازی سلسلے چلے آ رہے تھے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ بہت سے فقہی حلقوں اور مسلکوں میں حدیث اس وقت زیر بحث آتی جب کسی مسئلے کی تائید اور مسلک کے اعتراض کو دفع کرنا مقصود ہوتا۔ صحاحِ ستہ کے درس میں ان احادیث کی تاویل کی جاتی جو اپنے مذہب کے خلاف ہیں یا صحاح کی ان کتابوں کی احادیث کو پیش کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تائید میں ہیں۔ سارا زور اپنے فقہی مذہب و مسلک کو ثابت کرنے میں لگا دیا جاتا' چاہے اس میں کئی احادیث صحیحہ کی تاویل کرنی پڑتی۔ مذاہبِ فقہیہ کچھ ایسے آہنی سانچوں کی شکل اختیار کر چکے تھے جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا' پھیلنا ممکن نہیں تھا (یعنی اُس مذہب کو ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کر لینے' جیسے شافعیت سے حنفیت یا حنفیت سے شافعیت' یا عمل بالحدیث کا مسلک اختیار کر لینے کی مثالیں ہر زمانہ میں ملیں گی' لیکن ایک ہی مذہب کے دائرے میں رہ کر بعض مسائل سے جزوی طور پر عدول یا کسی دوسرے فقہی مسلک و مذہب کے مسئلہ کو اختیار کر لینے یا کسی مسئلہ میں حدیث پر عمل کرنے کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ اس لیے کہ بہت سے حضرات کے نزدیک ''تجزی تقلید'' صحیح نہیں۔) ہر مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے متعلق یہ خیال قائم کیے ہوئے تھے (اور ہیں) کہ ان کے مذہب کا سو فیصد صحیح ہونا تو اصل حقیقت ہے' باقی بشریت کی بنا پر غلطی کا

☆ گورنمنٹ کالج مانسہرہ ☆☆ ہزارہ یونیورسٹی' مانسہرہ

احتمال ہے۔اس طرزِ فکر کو عربی کے بلیغ انداز میں اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے:

مذهبنا صواب يحتمل الخطأ ومذهب غيرنا خطأ يحتمل الصواب

یعنی ہمارا مذہب تو درست اور حق ہے' البتہ اس میں خطا کا احتمال ہے' اور دوسرے کا مذہب فقہی اصلاً خطا اور ناصواب ہے' لیکن اس میں صحت کا احتمال ہے۔

اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب اربعہ یعنی مالکی' حنفی' شافعی اور حنبلی کے درمیان خلیج روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی اور اُن پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف منافرت تک اور بحث ومباحثہ بعض اوقات مجادلہ اور لڑائی تک پہنچ جاتا تھا۔اس سے زیادہ سخت معاملہ ان اہل علم کے ساتھ ہوتا تھا جو کلی یا جزئی طور پر عبادات میں حدیث پر عمل شروع کردیتے تھے۔(۱)

حضرت شاہ ولی اللہ کے عظیم مجددانہ کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ اور خدمتِ حدیث کی اہم کڑی ان کی فقہ وحدیث میں تطبیق اور مذاہبِ اربعہ میں جمع وتالیف کی کوشش تھی۔اس سے اس بشارتِ نبویؐ کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ:

''تم (یعنی شاہ ولی اللہ) سے خدا اس اُمت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا۔'' (۲)

شاہ صاحب ۱۱۴۳ھ میں تیس سال کی عمر میں' جب وہ تقریباً بارہ سال ہندوستان میں درس دے چکے تھے' عازمِ حج ہوئے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت میں قدرتی طور پر جو جامعیّت' قلب ونظر میں جو وسعت اور فطرتاً تطبیقی ذوق رکھا تھا' اس کو مزید جلا اور ترقی حجاز کے ایک سال سے زیادہ قیام کے دوران ملی۔حجاز مقدس میں قیام کے دوران آپ کو فقہ شافعی' حنبلی اور مالکی سے براہِ راست باخبر ہونے کا موقع ملا۔خصوصاً فقہ شافعی کے بہت بڑے عالم ومحدث شیخ ابوطاہر کردی مدنی کی وسعت نظر اور باطنی کمالات سے بہت متاثر ہوئے۔اسی طرح مالکی مذہب کے شیخ وفداللہ بن شیخ محمد بن محمد بن سلیمان سے بھی استفادہ کیا اور حنفی عالم شیخ تاج الدین قلعی سے بھی براہِ راست استفادہ کیا۔(۳)

شاہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ ''سفرِ حجاز سے قبل ہی انہیں مذاہب اربعہ اور ان کے اصولِ فقہ کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں' ان پر غور وفکر کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین کی روش کی پسندیدگی قرار پذیر ہوئی' اُس میں نورِ غیبی کی مدد بھی شامل تھی' اس کے بعد حرمین محترمین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔(٤)

شاہ صاحب نے سفرِ حجاز کے بعد غالی فقہاء (جو اپنے مسلک سے سرِمُو انحراف کے لیے تیار نہیں) اور فرقہ ظاہریہ (جو مطلقاً فقہاء کا منکر اور اُن فقہاء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں جو حاملینِ علم کے سرتاج اور دین کے امام و پیشوا ہیں) کی انتہا پسندانہ روش اور طرزِ فکر پر سخت سرزنش کی' اور ان دونوں کے غلو وانتہا پسندی (extremism) کو ناپسند کیا اور واضح الفاظ میں لکھا: ''اِنَّ الْحَقَّ اَمْرٌ بَیْنَ بَیْنَ''(٥) یعنی حق امر ان دونوں کے بین بین (درمیان) ہے' نہ پہلا فریق سو فیصد حق پر ہے اور نہ دوسرا فریق۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس پر کافی لمبی بحث کی ہے' ملاحظہ ہو:

''ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج' دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع' دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے' اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارے میں قدم پیچھے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہے' اور بعض اس کے برعکس۔ ان میں سے کسی ایک اصول سے بھی مطلقاً صرفِ نظر مناسب نہیں' جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے۔ اس بارے میں صراط مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے اور یہی امام حسن بصریؒ کا قول ہے۔'' (۶)

اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسائل فروعی میں ایسے علماء محدثین کی پیروی کرنی چاہیے جو فقہ وحدیث دونوں کے عالم ہوں' مسائل فقہیہ کو کلام اللہ اور حدیثِ رسول اللہ ﷺ سے ملاتے رہنا چاہیے..... اُمت کے لیے قیاسی مسائل کا کلام اللہ اور حدیثِ رسول اللہ ﷺ سے تقابل کرتے رہنا ضروری ہے' اس سے کبھی بھی بے نیازی نہیں ہوسکتی۔'' (۷)

شاہ صاحبؒ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کے قائل تھے اور ان کی مجتہدانہ بصیرت اور استنباط مسائل کے معترف تھے' لیکن ساتھ ساتھ وہ دوسرے ائمہ کی بالغ نظری اور علومِ دینیہ میں کمال کے تذکرے اپنی کتابوں' مثلاً **الانصاف فی بیان سبب الاختلاف**' **مصفّی**' **الخیر الکثیر**' **عِقد الجِید فی الاختلاف والتقلید** اور **حجۃ اللّٰہ البالغہ** میں مختلف انداز میں کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ موطا امام مالک کی حجت اور مقام ومرتبہ کا ذکر کرتے ہیں اور موطا کو حدیث کی اساسی کتابوں میں مانتے ہیں تو دوسری طرف مذہب شافعیؒ کے منقح ومصفّی اور حدیث سے اقرب ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ان کے وسیع الروایۃ' حدیث سے باخبر اور تفقہ میں عمیق النظر ہونے سے کرتے ہیں۔ (۸)

ان ائمہ اربعہ کے علوِّشان' وسعتِ نظر' دقتِ نظر اور اُمت پر احسان سے براہِ راست واقفیت اور ان تمام سے دلی عقیدت کی بنا پر شاہ ولی اللہ میں وہ جامعیت اور فقہ وحدیث کے تقابلی مطالعہ میں وہ توازن واعتدال پیدا ہوگیا جس کی قدرتاً ان علماء ومصنفین سے توقع نہیں کی جاسکتی' جن کا مطالعہ اور ذہنی وابستگی ایک ہی مذہب فقہی اور اس کے بانی ومؤسس سے تھی' اور اُن کو اُس سے باہر نکلنے کی (بہت سے طبعی وشخصی اسباب کی بنا پر) نوبت نہیں آئی۔

(۲) اجتہاد وتقلید کے درمیان نقطۂ اعتدال

حضرت شاہ صاحبؒ کے تجریدی اور امتیازی خصائص میں سے ایک خصوصیت اُن کا وہ متوازن اور معتدل مسلک اور نقطۂ اعتدال ہے جو انہوں نے اجتہاد وتقلید کے درمیان اختیار کیا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہر مسلمان کو' خواہ عامی ہو یا خاص' براہِ راست کتاب وسنت پر عمل کرنے اور ہر معاملہ میں وہیں سے احکامات حاصل کرنے کا مکلّف قرار دیتے تھے اور تقلید کی حرمت کے قائل تھے۔ اس گروہ میں متقدمین میں علامہ ابن حزمؒ اور موجودہ اہلِ حدیث پیش پیش نظر آتے ہیں' لیکن یہ بالکل غیر عملی بات ہے' اور اس کا ہر مسلمان کو مکلّف قرار دینا

تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسری طرف وہ گروہ تھا جو تقلید کو اسی طرح ہر مسلمان پر واجب قرار دیتا تھا اور اس کے تارک کو سخت فقہی احکام ''فاسق'' اور ''ضال'' سے یاد کرتا تھا' جیسا کہ پہلا گروہ مقلدین اور کسی خاص مذہب فقہ کے متبعین کو (گمراہ کہتا تھا)۔ اس گروہ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تقلید عوام کو نفسانیت اور خودرائی سے بچانے' مسلم معاشرے کو انتشار اور انارکی سے محفوظ رکھنے' دینی زندگی میں وحدت و نظم پیدا کرنے اور احکامِ شریعت پر بسہولت عمل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔(۹)

شاہ صاحبؒ نے اس بارے میں جو مسلک اختیار کیا اور جو تعبیر پیش کی وہ روحِ شریعت سے قریب تر' قرنِ اوّل کے عمل سے زیادہ ہم آہنگ اور عملی زندگی کے عین مطابق ہے۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب چوتھی صدی ہجری سے پہلے کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ لوگوں کو اپنی دینی زندگی میں' عبادات و معاملات میں جو نئے نئے مسائل و مشکلات پیش آتے تھے' اُن کو وہ کس طرح حل کرتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ کیسا راستہ اختیار کرتے تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل سے اس معاملہ پر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے طرزِ عمل کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔(۱۰)

(۳) تقلید کی جائز اور فطری شکل

شاہ صاحبؒ انتہائی انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ایسے شخص کو تقلید کے بارے میں معذور سمجھتے ہیں جو کسی مذہبِ فقہی یا معیّن امام کا مقلد تو ضرور ہے' لیکن اس کی نیت محض صاحبِ شریعت کی پیروی اور اتباعِ نبویؐ ہے' لیکن وہ اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا کہ وہ حکم شرعی اور جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہے' اس تک براہِ راست پہنچ جائے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں' مثلاً وہ عامی شخص ہے' اہلِ علم نہیں' یا اس کے پاس براہِ راست تحقیق کرنے کے لیے وقت نہیں' یا ایسے وسائل علم و تحقیق یا صلاحیت حاصل نہیں جس سے وہ نصوص کا خود پتا چلا لے' یا اُس سے مسئلہ استنباط یا اخذ کر سکے۔ شاہ صاحبؒ علامہ ابن حزم کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ ''تقلید حرام ہے اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے قول کو بلا دلیل قبول کرے''، تحریر فرماتے ہیں:

> ''ابن حزم کے قول کا مصداق وہ شخص نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول کے علاوہ کسی کو اپنے لیے واجب الاطاعت نہیں سمجھتا' وہ حلال اس کو گردانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حلال کیا اور حرام اُسی کو مانتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا' لیکن چونکہ اس کو براہِ راست آنحضرت ﷺ کے اقوال و احوال کا علم حاصل نہیں اور وہ آپؐ کے مختلف اقوال میں تطبیق دینے کی صلاحیت اور آپؐ کے کلام سے مسائل استنباط کرنے کی قدرت نہیں رکھتا' وہ کسی خدا ترس عالم کا دامن پکڑ لیتا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ صحیح بات کہتا ہے اور اگر مسئلہ بیان کرتا ہے تو اس میں وہ محض سُنّتِ نبویؐ کا پیرو اور ترجمان ہوتا ہے' جیسے ہی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں تھا' اس وقت وہ بغیر کسی بحث و اصرار کے اس کا دامن چھوڑ دیتا ہے' بھلا ایسے آدمی کو کوئی کیسے مطعون (blame) کرے گا' اور اس کو سنت و شریعت کا مخالف قرار دے گا؟''(۱۱)

شاہ صاحبؒ کے نزدیک فتویٰ لینے میں انسان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق حکم پر عمل کرے'

مقصود اتباعِ شریعت ہوتی ہے' تو ایسی تقلید کیسے ناجائز ہوئی۔ کسی فقیہہ کے بارے میں بقول شاہ صاحب:

''ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اُس پر آسمان سے فقہ اتاری ہے اور ہم پر اس کی اطاعت فرض کی ہے' اور یہ کہ وہ معصوم ہے۔ تو اگر ہم نے ان فقہاء اور ائمہ میں سے کسی کی اقتدا کی تو محض اس بنا پر کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا عالم ہے' اس کا فتویٰ (قول) دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں' یا وہ کتاب وسنت کے صریح حکم پر مبنی ہے' یا وہ استنباط کے اصولوں میں سے کسی اصول کے مطابق اس سے مستنبط کیا ہوا ہے' یا اُس نے قرائن سے یہ سمجھ لیا ہے کہ حکم فلاں علّت کے ساتھ وابستہ ہے (اور وہ علّت یہاں پائی جاتی ہے) اور اس کا قلب اس بات پر مطمئن ہو گیا ہے اس بنا پر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا' گویا زبانِ حال سے وہ کہتا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ جہاں یہ علّت پائی جاتی ہے وہاں یہ حکم ہوگا' اور یہ قیاسی مسئلہ اس عموم اور کلیہ میں شامل ہے' اس طرح اس حکم کی نسبت بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جا سکتی ہے لیکن ظنی طریقہ پر' اگر صورت حال یہ نہ ہوتی تو کوئی صاحب ایمان کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔ اگر ہمیں رسولِ معصوم ﷺ جن کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے' کوئی حدیث قابل وثوق سند سے پہنچے جو اس مجتہد یا امام کے فتوے اور قول کے خلاف ہو' اور ہم اس حدیث کو چھوڑ دیں اور اس ظنی طریقہ کی پیروی کریں' تو ہم سے بڑھ کر ناروا طریقہ اختیار کرنے والا کون ہوگا' اور ہمارا خدا کے سامنے کیا عذر ہوگا؟'' (۱۲)

(۴) مذاہب اربعہ کی خصوصیت

شاہ صاحب چاروں فقہی مذاہب (حنفی' مالکی' شافعی' حنبلی) کے بارے میں انتہائی معتدل نقطۂ نظر کے حامی تھے اور ان چاروں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے میں مصلحت قرار دیتے تھے۔ تحریر فرماتے ہیں:

''یاد رکھو کہ ان مذاہبِ اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے' اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے۔ اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں' ایک یہ کہ اُمت کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارے میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے' تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر وعلیٰ ہٰذا القیاس' ہر دور کے علماء نے اپنے پیشروؤں پر اعتماد کیا۔ عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے' اور نقل جب ہی ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے اس پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے۔ استنباط میں بھی یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ اُن کے دائرہ سے خارج ہو کر اجماع کے خلاف نہ ہو' اس لیے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ دوسرے علوم وفنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے۔ صَرف' نحو' طب' شاعری' لوہاری' نجاری' رنگ ریزی' سب ہنر اور پیشے (professions) میں مہارت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے۔ اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے' اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعتاً ایسا ہوتا نہیں۔'' (۱۳)

جب یہ بات متعین ہو گئی کہ سلف کے اقوال وتحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ ضروری ہو گیا کہ جن

اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے وہ سند صحیح سے مروی مشہور کتابوں میں مدوّن ہوں اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح و مرجوح اور عام و خواص کا امتیاز آسان ہو، جہاں اطلاق پایا جاتا ہے وہاں یہ پتا چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے؟ مختلف اقوال میں تطبیق دی جا چکی ہو اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جا چکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اجتہادات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا۔ ان پچھلے ادوار میں کوئی مذہب (فقہی) بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔

اسی طرح حجۃ اللہ البالغہ میں بھی ان مذاہب اربعہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چاروں مذاہب (four schools of thought) جو مدوّن ہو چکے ہیں اور احاطہ تحریر میں آ چکے ہیں، اس پر اُمّت کا اجماع ہو چکا ہے یا معتد بہ لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے کہ ان کی تقلید جائز ہے اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں جو مخفی نہیں، خصوصاً اس زمانہ میں کہ جس میں لوگوں کی ہمتیں بہت ہی پست ہو گئیں اور خواہشاتِ نفسانی کا غلبہ ہو گیا اور ہر آدمی اپنی رائے پر ناز کرنے لگا۔''(۱۴)

(۵) شاہ صاحب حنفی تھے یا اہلِ حدیث؟

فرقہ پرستی اور مسالک میں تعمق کی وجہ سے لوگ ہر شخص کو، چاہے اس کا علمی پایہ کتنا ہی بلند ہو، کسی نہ کسی فرقہ کی طرف منسوب کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہی بحث شاہ ولی اللہؒ کے متعلق بھی چھیڑ دی گئی کہ وہ حنفی تھے یا اہل حدیث؟ بالفاظ دیگر وہ مقلّد تھے یا غیر مقلّد؟ لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح فہم دین عطا فرمایا ہے ان کے حق میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ شاہ صاحب کا مقامِ عالی اور ایک عالم ربانی اور مجدد ہونے کی حیثیت سے آپ کی بلند پایہ شخصیت اس سے بالاتر ہے کہ اُن کو اس بحث کا موضوع بنا کر ان کی تصنیفات (اور عظیم علمی کام) کی اصلی قدر و قیمت کو گھٹا دیا جائے(۱۵) اور بقول مولانا محمد منظور نعمانیؒ:

''ملّت کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ شاہ صاحبؒ کی وہ ذات جس کا صحیح عادلانہ فیصلہ مقلدین اور غیر مقلدین دونوں کو ایک معتدل مسلک پر جمع کر سکتا تھا اور ان کی باہمی منافرت اور کشمکش اور بے جا عصبیت کو مٹا کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا تھا، انہی کو بحیثیت ایک فریق اس بحث میں دھر لیا ہے۔ ایک طرف کوشش شروع ہوئی کہ ان کو عہد حاضر کی عرف اور اصطلاح کے مطابق ٹھیٹھ غیر مقلد ثابت کیا جائے، دوسری طرف آپ کو عرفی قسم کا پکّا حنفی اور مروّجہ تقلید کا حامی ثابت کرنے کے لیے زور لگایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات کا جو اصل مقصد تھا وہ بالکلیہ فوت ہو گیا۔''(۱۶)

(۶) تحقیقی قول پر عمل کرنے کے متعلق شاہ صاحب کی وصیت

شاہ صاحبؒ نے اس دُنیا سے انتقال کرنے سے تھوڑی دیر پہلے جو وصیت اپنے اعزہ و اقارب اور اپنے متوسّلین اور عقیدت مندوں کو کی، وہ یہ ہے:

''اس عاجز کی پہلی وصیت یہ ہے کہ عقائد و اعمال دونوں میں کتاب و سنّت کی سخت پابندی کی جائے۔ قرآن اور حدیث کے معانی کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ غور اور تدبّر سے کام لیں اور برابر اس میں مشغول رہیں۔ اگر عربی نہ جاننے کی وجہ سے آدمی خود پر ایک عقیدہ اور عمل کو قرآن اور حدیث سے اخذ کرنے کی

استعداد نہ رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ روزمرہ کم از کم ایک دو ورق قرآن اور ایک دو ورق حدیثِ رسولؐ کا ترجمہ کسی عالم سے سن لیا کرے۔ عقائد میں قدماء اہلِ سنت (سلف صالحین، صحابہ اور تابعین) کا مسلک اختیار کیا جائے۔ سلف صالحین نے جس بات کے متعلق کریدنا (کاوش کرنا) مناسب نہیں سمجھا اس سے تم بھی روگردانی کرو اور معقولیانِ خام کے شبہات اور تشکیکات پر مطلق توجہ نہ کی جائے۔ فقہ کے فروعی مسائل میں ان علماء محدثین کی پیروی کی جائے جو فقہ اور حدیث کے جامع ہوں، چنانچہ ہمیشہ یہ اصول رکھنا چاہیے کہ جس مسئلہ فقہ میں تحقیق کرنا مقصود ہو، اس کو قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے، جو اس کے موافق نظر آئے اس کو قبول کریں اور جو بات کتاب وسنت کے مطابق نہ ہو اس کو قائل کے منہ پر دے ماریں۔ یاد رکھو کہ اُمت مسلمہ کبھی اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتی کہ جو مسئلہ بھی پیش آئے اور وہ کسی امام یا فقیہہ کا اجتہاد ہو، اس کو کتاب وسنت پر پیش کیا جائے (اُن کی صحت وسقم کو جانچنے کا معیار یہی ہے)۔ ان جامد طبع اور کور بصیرت فقہاء کی وہ بات ہرگز نہ سنو جس کی سند کسی عالم کی تقلید ہو، اس لیے انہوں نے سنت یعنی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کا اتباع کرنا چھوڑ دیا ہو۔ اُن کی باتوں پر ہرگز التفات نہ کیا جائے۔ اللہ کی خوشنودی اور اس کا قرب اُن لوگوں سے دُور رہنے میں ہے۔'' (۱۷)

شاہ صاحبؒ شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے تقلید کے بارے میں فرمایا:

''یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ فقہائے مقلدین میں سے بعض لوگ اپنے امام کے ماخذ کے ضعیف ہونے سے واقف ہوتے ہیں اور اس کا دفاع نہیں پاتے مگر پھر بھی وہ اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرتے ہیں، کتاب وسُنّت اور قیاساتِ صحیحہ جس مذہب کی صداقت کی شہادت دیتے ہیں محض اپنے امام کی تقلید جامد کے باعث اسے چھوڑ دیتے ہیں، بلکہ کتاب وسنت کے ظاہر کو چھوڑنے کے لیے دور کی اور باطل تاویلات کرتے ہیں۔'' (۱۸)

(۷) اختلافی مسائل میں صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ کا طرزِ عمل

دورِ صحابہؓ اور تابعینؒ میں کئی مسائل میں باہمی اختلاف تھا، لیکن وہ اختلاف علمی اختلاف تک محدود رہا، کبھی افتراق اور تکفیر وتفسیق کا سبب نہیں بنا۔ مثلاً صحابہ اور تابعین کے عہد میں بعض سورۂ فاتحہ کے آغاز میں بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض نہیں پڑھتے تھے۔ فجر کی نماز میں بعض کا معمول قنوت پڑھنا تھا اور بعض نہ پڑھنے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ بعض خون بہہ نکلنے کے بعد وضو کرتے تھے اور بعض نہیں کرتے تھے۔ بعض آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کرتے تھے اور بعض وضو نہیں کرتے تھے۔ اونٹ کا گوشت کھالینے کے بعد بعض وضو کرتے اور بعض نہ کرتے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ (۱۹)

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور ان کے عظیم شاگرد امام محمدؒ وغیرہ اور امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ کی اقتدا کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے، اگرچہ مالکیہ سرّاً وجہراً سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہیں تھے۔ ہارون الرشید نے ایک مرتبہ سینگی لگوا لینے کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھائی تو امام ابو یوسفؒ نے اس کے پیچھے نماز پڑھی اور اس کا اعادہ بھی نہیں کیا۔ خلیفہ مذکور کو امام مالکؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ سینگی لگوا لینے کے بعد وضو کرنا لازم نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول تھا کہ نکسیر پھوٹنے اور سینگی لگوا لینے کے بعد وضو کر لینا چاہیے۔ کسی نے ان سے

پوچھا کہ جس کا خون بہہ نکلا اور وہ وضو کیے بغیر امامت کرے تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ آپؒ نے فرمایا کہ ''اس کے تو معنی ہوئے کہ میں امام مالکؒ اور سعید بن المسیبؒ کے پیچھے نماز پڑھوں (کیونکہ وہ نکسیر کے بعد وضو کے قائل نہیں)''۔(۲۰)

ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو ازراہِ ادب امام ابوحنیفہ کا پاس ملحوظ رکھ کر قنوت کو ترک کر دیا اور بغیر قنوت کے نماز پڑھ لی۔ یہ بھی امام شافعیؒ ہی کا قول ہے کہ بعض اوقات ہم اہلِ عراق کے مذہب پر عمل کر لیا کرتے ہیں۔(۲۱)

فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ امام ابو یوسفؒ نے حمام میں غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھائی۔ جب وہ نماز پڑھ چکے اور سب لوگ منتشر ہو گئے تو اُن سے کہا گیا کہ حمام کے کنوئیں میں ایک مردہ چوہیا پائی گئی' اس پانی سے آپ نے غسل کیا اور نماز پڑھائی۔ آپ نے فرمایا: کیا مضائقہ ہے' ہم اہلِ مدینہ بھائیوں کے مذہب (فقہی) پر عمل کریں گے' جس کی سند یہ حدیث ہے کہ جب دو بڑے مٹکے پانی کے ہوں تو اس پر نجاست اثر نہیں کرتی۔(۲۲)

یہ وہ توسّع اور وسعت ہے جو اسلامی اصولوں کی روشنی میں مختلف فقہی مذاہب پر عمل کرنے میں ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> ''انہیں فقہ کے مذاہبِ اربعہ کو حضور ﷺ نے یکساں تصور کرنے کی ہدایت کی' کیونکہ فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو عنایتِ الٰہی ہے' اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا اس کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی روح کے جوہر میں ان تمام فقہی فروعات کا بنیادی علم موجود ہے اس لیے آپ کی نظر میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر کوئی امتیاز نہ ہو۔''(۲۳)

آگے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''بات دراصل یہ ہے کہ فقہ کے مذاہب گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں' لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے وہ مذاہب فقہ میں سے ہر مذہب میں موجود ہیں۔''(۲۴)

شاہ صاحب کی مندرجہ بالا تحقیق کے مطابق جب چاروں فقہی مذاہب برحق ہیں تو پھر فقہی فروعی مسائل میں وسعتِ نظری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور ان فروعی مسائل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تفسیق و تکفیر سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے' کیونکہ جب مجتہدین اور فقہاء کے باہمی اختلافاتِ علمی میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی تو پھر غیر منکر پر نکیر خود منکر ہے۔ اور بقول مولانا مفتی محمد شفیعؒ:

> ''اجتہادی و فروعی اختلافات کے ساتھ جو معاملہ آج کل کیا جا رہا ہے کہ اسی بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنا لی گئی ہے اور اس پر باہمی جنگ و جدال اور سب و شتم تک نوبت پہنچا دی گئی ہے' یہ طرزِ عمل بلاشبہ وَلَا تَفَرَّقُوْا (یعنی تفرقہ میں مت پڑو) کی کھلی مخالفت اور صحابہؓ اور تابعین کی سنت کے بالکل خلاف ہے۔ اَسلافِ اُمت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلافات کی بنا پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے)' مثلاً امام شافعی اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا' اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوگی۔ اس کے بالمقابل امام ابوحنیفہؒ

کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں اس لیے حنفیہ نہیں پڑھتے لیکن اُمت کی پوری تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارکِ نماز کہتے ہوں کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوئیں اس لیے تم بے نمازی ہو یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکراتِ شرعیہ پر کی جاتی ہے۔'' (۲۵)

حوالہ جات

(۱) سید ابوالحسن علی ندویؒ' تاریخ دعوت وعزیمت' مجلس نشریات اسلام' کراچی' ج ۵' ص ۱۹۷۔۱۹۸۔

(۲) شاہ ولی اللہؒ' فیوض الحرمین' بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت' ج ۵' ص ۱۹۸۔

(۳) تاریخ دعوت وعزیمت' ص ۱۹۹۔

(۴) شاہ ولی اللہ' الجزء اللطیف فی ترجمة العبد الضعیف' ص ۲۰۳۔۲۰۴' بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت' ج ۵' ص ۲۰۱۔

(۵) شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ج ۱' ص ۳۸۱۔

(۶) حجۃ اللہ البالغہ' ترجمہ: مولانا منظور الوجیدی'' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ج ۱' ص ۳۸۱۔

(۷) شاہ ولی اللہ' وصیت نامہ فارسی' ص ۲۔۳' بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت' ج ۵' ص ۲۰۲۔

(۸) شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' ص ۴۸۱۔۴۸۶۔ (ترجمہ: مولانا عبدالرحیم)

(۹) سید ابوالحسن علی ندوی' تاریخ دعوت وعزیمت' ج ۵' ص ۲۰۴۔۲۰۵۔

(۱۰) شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ (ترجمہ: مولانا محمد منظور الوجیدی)' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ج ۱' ص ۳۷۳۔۳۸۰۔

(۱۱) حجۃ اللہ البالغہ' ص ۳۷۶۔۳۷۸۔

(۱۲) ایضاً۔

(۱۳) شاہ ولی اللہ' عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید' ص ۳۶۔۳۸۔

(۱۴) شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' ص ۳۷۶۔

(۱۵) مولانا عبدالرحیم' مختصر سوانح شاہ ولی اللہؒ' حجۃ اللہ البالغہ' ص ۱۶ (ترجمہ مولانا عبدالرحیم)۔

(۱۶) ایضاً۔

(۱۷) ایضاً' ص ۱۷۔

(۱۸) شاہ ولی اللہ' حجۃ اللہ البالغہ' ج ۱' ص ۳۷۸ (ترجمہ مولانا منظور الوجیدی)

(۱۹) ایضاً' ج ۱' ص ۵۱۶۔۵۱۷ (ترجمہ مولانا عبدالرحیم)

(۲۰) ایضاً' ص ۵۱۷۔

(۲۱) ایضاً۔

(۲۲) ایضاً۔

(۲۳) قاضی جاوید' افکار شاہ ولی اللہ' ص ۱۷۳۔

(۲۴) محمد سرور' ارمغان شاہ ولی اللہ (ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور) ص ۱۷۸۔

(۲۵) مولانا مفتی محمد شفیعؒ' معارف القرآن (فرید بک ڈپو' دہلی)' ج ۲' ص ۱۴۴۔ اور اختلافِ فقہاء وغیرہ پر اعتدال کے لیے دیکھیے: مفتی محمد شفیعؒ کی کتاب ''وحدت اُمت'' (مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور)

شریعتِ اسلامی میں شراب نوشی کی سزا (۳)

حافظ نذیر احمد ہاشمی

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح البخاری میں شراب نوشی کی سزا کے بارے میں چھ اقوال کا ذکر کیا ہے، جن میں سے اہم تین اقوال ہیں:

پہلا قول:

رسول اللہ ﷺ نے شرابی کے لیے کوئی معین سزا مقرر نہیں کی ہے بلکہ ہر شرابی کو اس کے مناسبِ حال سزا دیا کرتے تھے۔ یہ قول انہوں نے ابن المنذر کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب شراب کے نشہ میں مدہوش آدمی لایا جاتا تھا تو آپ اس کے بارے میں مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا حکم صادر فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا یہ طرزِ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ شراب نوشی میں کوئی متعین حد نہیں بلکہ تنکیل اور تبکیت ہی کافی ہے، کیونکہ اگر آپ ﷺ کی دی ہوئی مذکورہ بالا سزا حد کا درجہ رکھتی تو آپ ﷺ اس کی مقدار ضرور بیان فرماتے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شرابیوں کی کثرت ہوگئی اور انہوں نے اس سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ مانگا۔ ان کا یہ طرزِ عمل (صحابہ کرامؓ سے مشاورت) بھی اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس بارے میں ان کے پاس کوئی واضح ارشاد آپ ﷺ کا موجود نہیں تھا، کیونکہ آپ ﷺ کے واضح ارشاد کی موجودگی میں مشاورت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

مزید باہمی مشاورت کی بنیاد پر کسی معین سزا میں محض اس بنیاد پر اضافہ کرنا کہ شرابیوں کی کثرت ہوگئی ہے کوئی معقول بات نہیں، ورنہ تو قاذفین اور ان کی فحش گوئی میں اضافہ کو بنیاد بنا کر حد قذف کی مقررہ سزا میں بھی اضافہ کرنا چاہیے تھا۔

نیز مشاورت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجویز (**اذا شرب سکر واذا سکر هذی واذا هذی افتری وحد المفتری ثمانون جلدة**) کی بنیاد پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ رائے ٹھہری کہ شراب نوشی کی سزا حد قذف کی سزا (اسی کوڑے) مقرر کی جائے، اسّی کوڑے کی سزا مقرر ہونے کے بعد خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا ''اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَسُنَّہٗ'' اور ''اِنَّمَا ھُوَ شَیْءٌ صَنَعْنَاہُ'' سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ تحدید کی روایات منقولہ عن انس و علی میں اختلافات ہیں لہٰذا ثابت شدہ اور محقق بات (کہ نبی کریم ﷺ شرابی کی پٹائی کا حکم فرماتے تھے) کو قبول کرنا چاہیے۔

اس قول کے قائلین بعض اہلِ علم کون ہیں' تلاشِ بسیار کے باوجود ان کے ناموں کا علم نہیں ہوسکا' سوائے ابن شہاب زہری کے جن کا قول آگے کسی مقام پر ذکر کیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں صرف اتنا لکھا ہے:

ان الطبری وابن المنذر وغیرهما حکوا عن طائفة من اهل العلم ان الخمر لا حدّ فیها وانما فیها التعزیر (۵۹)

اسی طرح علامہ شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں اس قول کے قائلین کی تعیین کیے بغیر لکھا ہے:

وحکی ابن المنذر والطبری وغیرهما عن طائفة من اهل العلم ان الخمر لاحدّ فیها وانما فیها التعزیر (۶۰)

عبدالرحمٰن الجزیری نے بھی تعیین کیے بغیر لکھا ہے:

جمهور الائمة والعلماء علی انه حد وبعضهم قال انه من باب التعزیر (۶۱)

اس قول کے قائلین نے اپنے مذہب کے اثبات کے لیے جو احادیث مبارکہ پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب کسی شرابی کو آپؐ کی خدمت میں لایا جاتا تھا تو آپؐ حاضرین مجلس کو اسے مارنے کا حکم فرماتے تھے۔ ان میں سے کوئی تو تھپڑ اور گھونسے مارتا' کوئی جوتے مارتا اور کوئی کپڑے کا کوڑا بنا کر مارتا' حتیٰ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو صراحتاً یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ نے شراب نوشی کے بارے میں کوئی سزا متعین نہیں فرمائی' جبکہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تمام دورِ خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری دورِ خلافت تک کسی معیّن سزا کے نہ ہونے کی صراحت موجود ہے۔ مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ اگر شراب نوشی کی سزا دیتے وقت شرابی کی موت واقع ہوگئی تو میں اس کی دیت ادا کروں گا' کیونکہ اس سزا کی تعیین رسول اللہ ﷺ نے نہیں بلکہ ہم نے خود کی ہے' یہ اور ان جیسی مزید روایات (جن کا ذکر آگے آرہا ہے) اس قول کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

احادیث مؤیدہ قول بالا:

(۱) ..... **عن ابن عباس ان النبی ﷺ لم یقت فی الخمر حدا ..... وقال ابن عباس شرب رجل فسکر فلقی یمیل فی الْفَجّ فانطلق بِهٖ الی النبی ﷺ ' فلما حاذی یدار العباس انفلت فدخل علی العباس فالتزمه' فذکر ذٰلك للنبی ﷺ فضحك وقال أفعلها ولم یأمر فیه بشیء** (۶۲)

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی پر کوئی حد مقرر نہیں فرمائی ..... عبداللہ بن عباس کا کہنا ہے کہ ایک شخص کو شراب نوشی پر نشہ چڑھ گیا' کسی نے اس کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جانے لگا۔ جب وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس پہنچا تو بھاگ کر حضرت عباس سے چمٹ گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کے بارے میں بتایا گیا تو آپؐ نے ہنستے ہوئے فرمایا: کیا واقعی اس نے ایسا ہی کیا؟ اور پھر آپ ﷺ نے اس کے بارے میں کسی سزا کا حکم نہیں فرمایا۔''

(۲) ..... **عن عمیر بن سعید قال سمعت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال :ما کنت لاقیم حدًّا علی**

احد فیموت فاجد فی نفسی الا صاحب الخمر فانہ لو مات ودیتہ' وذٰلك ان رسول اللّٰہ ﷺ لم یَسُنَّہٗ' (٦٣)

''عمیر بن سعید کا کہنا ہے کہ میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر میرے حد لگانے کے نتیجے میں کسی کی موت واقع ہوگئی تو مجھے اس پر کوئی رنج وغم نہیں ہوگا' سوائے شرابی کے' اگر وہ حد لگانے کے نتیجے میں مر گیا تو میں اس کی دیت ادا کروں گا' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی پر سزا دینے کا کوئی ضابطہ مقرر نہیں فرمایا تھا (کوئی معین تعداد میں کوڑے مقرر نہیں فرمائے)۔''

نسائی اور ابن ماجہ نے یہ حدیث بروایت شعبی عن عمیر بن سعد زیادہ وضاحت کے ساتھ نقل کی ہے:

الشعبی عن عمیر بن سعد قال سمعت علیا یقول :من اقمنا علیہ حدا فمات فلا دیة لہ الا من ضربناہ فی الخمر

اس روایت میں آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''**فانما ھو شیء صنعناہ**''

[نوٹ: ''**لم یسنہ**'' کا مفہوم **لم یُعَیِّنْ فی الحد مقداراً یبلغ ثمانین** ہے۔ یعنی حد خمر میں اسی کوڑے رسول اللہ ﷺ نے متعین نہیں کیے۔ ''**انما ھو**'' **ای مقدار حد الخمر وھو ثمانون** ''**صنعناہ**'' **نحن**۔ بلکہ اسی کوڑے کی حد ہم نے متعین کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت اور ابوساسان کے طریق سے مروی روایت جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول موجود ہے (**جلد النبی ﷺ اربعین**) میں بظاہر تضاد ہے' کیونکہ روایت زیر بحث میں ''**لم یَسُنَّ فیہ**'' اور ابوساسان کی روایت میں چالیس کوڑے مارنے کی صراحت موجود ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس تعارض کا دفعیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **لم یَسُنَّ فیہ شیئًا** کا معنی **لم یَسُنَّ شیئا زائدًا علی الاربعین** ہے۔ اس کی تائید دوسری روایت بواسطہ شعبی عن عمیر بن سعد میں مروی ان کے اس قول سے بھی ہوتی ہے ''**انما ھو شیء صنعناہ**'' یعنی چالیس کوڑے (معینہ حد) پر اضافہ کردہ چالیس کوڑے کی تعیین ہم نے کی ہے اور ہم نے ہی اس کا مشورہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ اضافہ شدہ چالیس کوڑے مارنے کے نتیجے میں اگر اس کی موت واقع ہوگئی تو میں اس کی دیت ادا کروں گا' کیونکہ یہ اضافہ شدہ کوڑے حد نہیں جن کے مارنے کے نتیجے میں شرابی کا خون ہدر ہو۔ حد کے نتیجے میں اگر محدود کی موت واقع ہوگئی تو بالاتفاق اس کی دیت نہیں ہے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا مذکورہ بالا مفہوم متعین کیا جائے (اور یہ مفہوم متعین کرنا اس لیے ضروری ہے' تاکہ اس روایت سے اس کا تعارض نہ ہو جو حصین بن المنذر (ابوساسان) کے طریق سے مروی ہے اور جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اخیافی بھائی ولید بن عقبہ کو شراب نوشی کی پاداش میں جب عبداللہ بن جعفر حد لگاتے ہوئے چالیس کوڑے پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **حسبك جلد النبی ﷺ اربعین**) تو قائلین تعزیر کے لیے اس روایت سے استدلال کرنا مشکل ہو جائے گا۔]

(٣) سائب بن یزید کی روایت ہے:

کنا نؤتی بالشارب علی عھد رسول اللّٰہ ﷺ وامرة ابی بکر وصدراً من خلافة عمر' فنقوم الیہ بایدینا ونعالنا واردیتنا' حتی کان آخر امرة عمر فجلد اربعین حتی اذا عتوا وفسقوا جلد ثمانین (٦٤)

''رسول اللہ ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جب شرابی کو پکڑ کر لایا جاتا تو ہم اٹھ کر ہاتھوں' جوتوں اور کپڑے (کے کوڑوں) سے اس کی پٹائی کرتے تھے یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور تک چلتا رہا۔ آخری دورِ خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرابی کو چالیس کوڑے لگانے شروع کیے' پھر جب لوگ حد سے بڑھنے لگے تو چالیس کے بجائے اسّی کوڑے لگائے۔''

سائب بن یزید کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوت خلافت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور تک شراب نوشی کی کوئی متعین سزا نہیں ہوتی تھی' بلکہ شرابی کی حسب حال مار پیٹ کی جاتی تھی اور یہ قائلینِ تعزیر کی مضبوط دلیل ہے۔ صحیح بخاری کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی تعیین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں ہوئی' جبکہ نسائی کی روایت بواسطہ مغیرہ بن عبدالرحمٰن عن الجعید میں ''حتی کان وسط امارة عمر فجلد فیها اربعین'' کے الفاظ ہیں۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے' کیونکہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دور میں نہیں بلکہ وسط میں ہوئی ہے۔

عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں عبید بن عمیر (کبار تابعین میں سے ہیں) سے بسند صحیح سائب بن یزید کی روایت کے مطابق نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان عمر جعله اربعین' فلما رآهم لا یتناهون جعله ستین سوطا' فلما رآهم لا یتناهون جعله ثمانین سوطاً .....

عبدالرزاق کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوت اور خلافت صدیقی میں شراب نوشی پر تعزیری سزا ہی دی جاتی تھی۔

خلافت فاروقی کے آغاز میں بھی شرابی کو تعزیر ہی لگائی گئی۔ اپنی خلافت کے وسطی دور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سزا کی تعیین پہلے چالیس کوڑوں' پھر ساٹھ کوڑوں اور بالآخر اسّی کوڑوں کی صورت میں کر دی۔ اس مضمون کے آغاز ہی میں حد اور تعزیر کی تعریف اور ان کا باہمی فرق بیان کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ حد قرآن وسنّت کی رو سے متعین سزا کا نام ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی بیشی کا کسی کو اختیار نہیں ہے' جبکہ تعزیری سزا امامِ وقت کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے' جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات وغیرہ کی تبدیلی سے اس میں مقدار' نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔ حد وتعزیر کی مذکورہ بالا تعریف کو سامنے رکھا جائے تو سائب بن یزید کی روایت سے شراب نوشی کی سزا کا تعزیر ہونا ہی متعین ہوتا ہے۔

(٤) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

اتی النبی ﷺ برجل قد شرب' قال: اضربوه قال ابوهریرة فمنا الضارب بیده والضارب بنعله والضارب بثوبه' فلما انصرف قال بعض القوم: اخزاك اللّٰه' قال: ((لَا تَقُوْلُوْا هٰكذا.....))

''رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شرابی لایا گیا' آپؐ نے (کوئی معین سزا دیے بغیر) حاضرین مجلس کو اسے مارنے کا حکم دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اسے ہاتھ سے' کوئی جوتے سے اور کوئی کپڑے

(کے کوڑے) سے مارنے لگا' جب مار پٹائی ختم ہو کر شرابی جانے لگا تو حاضرین میں سے کسی نے بددعا دیتے ہوئے کہا: اللہ تجھے رسوا کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس طرح نہ کہو۔''

(۵) حضرت عقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

اتی النبی ﷺ بنعیمان او بابن النعیمان وھو سکران فأمر النبی ﷺ من کان فی البیت ان یضربوہ' قال فضربوہ' فکنت انا فیمن ضربہ بالنعال (۶۵)

''نعیمان یا نعیمان کے بیٹے کو نشے کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے گھر میں موجود لوگوں کو اسے مارنے کا حکم دیا۔ عقبہ بن الحارث کا کہنا ہے کہ جوتوں سے مارنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔''

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں کسی معین سزا کا ذکر نہیں ہے۔

(۶) امام زہری کا بیان ہے:

ان النبی ﷺ لم یفرض فی الحد خمرًا' وانما کان یأمر من حضرہ ان یضربوہ بایدیھم ونعالھم (۶۶)

''رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی کے بارے میں کوئی حد (معین سزا) مقرر نہیں فرمائی' بلکہ آپ حاضرینِ مجلس کو ہاتھوں اور جوتوں سے مارنے کا حکم فرماتے تھے۔''

(۷) انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

ان النبی ﷺ ضرب فی الخمر بالجرید والنعال وجلد ابوبکر اربعین (۶۷)

''رسول اللہ ﷺ شرابی کو کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارنے کا حکم فرماتے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے لگائے (رسول اللہ ﷺ نے کوئی معین سزا نہیں دی)۔''

اور صحیح مسلم میں اس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

ان نبی اللہ ﷺ جلد فی الخمر بالجرید والنعال ثم جلد ابوبکر اربعین' فلما کان عمر ودنا الناس من الریف والقری' قال :ما ترون فی جلد الخمر؟ فقال: عبدالرحمٰن بن عوف أریٰ ان تجعلھا کأخف الحدود قال :فجلد عمر ثمانین (۶۸)

''رسول اللہ ﷺ شرابی کو کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارنے کا حکم فرماتے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے شروع کیے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ شہروں سے نکل کر گاؤں اور کھلی فضاؤں میں رہن سہن اختیار کر کے آسودہ ہو گئے (تو شراب نوشی کی کثرت ہو گئی) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صورتحال کا نوٹس لے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شراب نوشی کی سزا کے بارے میں رائے طلب کی۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری رائے میں سزا کے لحاظ سے کم تر حد والی سزا اس کو دی جائے۔ ان کے مشورہ پر عمل کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے کی سزا مقرر کی۔''

اس روایت سے شراب نوشی کی سزا کا تعزیر ہونا ہی متعین ہوتا ہے۔ غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ طرزِ عمل (چالیس کی بجائے اسی کوڑے مارنا) ان مجرموں کے بارے میں اختیار فرمایا تھا جو شراب کی سزا کو ہلکی سمجھ کر جری ہو گئے تھے۔ ان کو اس عمل سے روکنے کے لیے بطور تعزیر اسّی کوڑے مارنے کا حکم دیا تھا۔

(۸) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان جو امام نسائی نے نقل کیا ہے وہ بھی شراب نوشی پر نافذ شدہ سزا کو تعزیر قرار دیتا

ہے' جو درج ذیل ہے:

''نبی کریم ﷺ کے دور میں جو شخص شراب نوشی کے جرم میں گرفتار کر کے آپ کے پاس لایا جاتا آپ کے حکم پر اس کی گھونسوں' جوتوں اور چھڑیوں کے ساتھ پٹائی کی جاتی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی باقاعدہ کوئی سزا مقرر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ انہوں نے اندازہ کیا کہ آپ ﷺ کے دور میں شرابی کو کتنی ضربیں لگائی جاتی تھیں' اس کی روشنی میں انہوں نے چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کر دی۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے (جب شراب نوشی کے جرائم میں اضافہ ہونے لگا) اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت کی تو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی کہ **اذا شرب سکر** (جب کوئی شراب پیے گا تو نشہ چڑھے گا) **واذا سکر هذی** (اور جب نشہ چڑھے گا تو ہذیان بکے گا) **واذا هذی افتری** (اور ہذیان بکے گا تو کسی پر بے بنیاد تہمت بھی لگائے گا) اور تہمت لگانے کی سزا از روئے قرآن مجید اسی کوڑے ہیں' اس لیے شرابی کو بھی یہی سزا دینی چاہیے۔[٦٩]

(۹) **عبدالرزاق' ابن جریج و معمر سئل ابن شهاب : کم جلد رسول اللّٰہ ﷺ فی الخمر؟ فقال: لم یکن فرض فیها حدًا' کان یامر من حضره ان یضربوه بایدیهم ونعالهم حتّٰی یقول لهم ارفعوا۔**

مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ شراب نوشی پر کوئی مخصوص سزا (حد) مقرر کرنے کے حق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے رسالت مآب ﷺ کا کوئی حکم یا آپ کی قائم کردہ کوئی سنت نہیں تھی' بلکہ انہوں نے اپنے قیاسی استدلال کی بنیاد پر چالیس یا اسی کوڑے لگانے کی سزا مقرر کی تھی۔ اس مسلک کی تقویت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو ہم نے ماسبق میں صحیح البخاری' سنن النسائی اور سنن ابن ماجہ کے حوالے سے نقل کیا ہے: ''**مَا کنت اذی من اقمت علیه الحد الا شارب الخمر' فان رسول اللّٰہ ﷺ لم یسُنَّ فیه شیئا انما هو شیءٌ جعلناه نحن**''۔ یعنی اگر کوئی مجرم حد نافذ کرنے کے نتیجے میں مر جائے تو اس کی کوئی دیت نہیں سوائے شراب پینے والے کے' اگر وہ کوڑے مارنے کے نتیجے میں مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا' کیونکہ اس کی سزا رسول اللہ ﷺ نے نہیں بلکہ ہم نے خود مقرر کی ہے۔''

مزید عبداللہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شرابی کو کوئی متعین سزا دیے بغیر حاضرین مجلس سے اس کی پٹائی کروائی ہے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے:

اُتی رسول اللّٰہ ﷺ بشارب وهو بحنین فحثی فی وجهه التراب' ثم امر اصحابه فضربوه بنعالهم' وما کان فی ایدیهم حتی قال لهم ارفعوا فرفعوا' فتوفی رسول اللّٰہ ﷺ ثم جلد ابوبکر فی الخمر اربعین' ثم جلد عمر اربعین صدرًا من امارته' ثم جلد ثمانین فی آخر خلافته' ثم جلد عثمان الحدین کلیهما ثمانین واربعین' ثم اثبت معاویة الحد ثمانین [٧١]

''حنین کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شرابی کو لایا گیا' آپؐ نے اس کے منہ پر مٹی پھینکتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی پٹائی کرنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ نے جوتوں اور جوان کے ہاتھ لگا سے مارنا

شروع کیا حتیٰ کہ آپؐ نے انہیں رُکنے کا حکم دیا۔ وفات تک آپؐ کا یہی معمول تھا۔ آپؐ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے مارنے شروع کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی خلافت کے دور آغاز میں چالیس کوڑے اور آخری دور خلافت میں اسّی کوڑے کا معمول بنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کبھی چالیس اور کبھی اسی کوڑے مارتے تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسّی کوڑے مقرر ہو گئے۔''

اگر شراب نوشی کی کوئی متعین سزا ہوتی یا آپؐ نے اس کی کوئی متعین سزا مقرر کی ہوتی تو حضرت عمرؓ اس میں اضافہ کیسے کر سکتے تھے۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معمول مختلف ہونے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی متعین سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر نہیں ہوئی تھی۔

دوسرا قول

امام شافعیؒ، احمدؒ، اہل الظاہر اور بقول ابن حزم ابوبکر صدیق، عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی، حسین بن علی اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے ہیں۔

دلائل

..... **عن قتادة عن انس بن مالك ان النبی ﷺ جلد فی الخمر بالجريد والنعال وجلد ابوبكر اربعين، فلما ولی عمر دعا الناس فقال لهم ان الناس قد دنوا من الريف وقال مسدد من القری والريف فما ترون فی حد الخمر؟ فقال له عبدالرحمن بن عوف :نری ان تجعله كأخف الحدود فجعله فيه ثمانين** (۷۲)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شراب پینے والے کو کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارا کرتے تھے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چالیس کوڑے مارتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور شام و عراق وغیرہ سرسبز و شاداب علاقے فتح ہو گئے اور لوگوں نے ان علاقوں میں بود و باش اختیار کر لی اور ان کی زندگیوں میں عیش و عشرت اور فراخی آ گئی تو شراب نوشی کی کثرت ہو گئی، لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کو روکنے کے لیے حد خمر میں اضافہ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے فرمایا: **ما ترون فی حد الخمر** ؟ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ہماری یہ رائے ہے کہ قرآن مجید میں بیان شدہ حدود میں سے جس حد کی مقدار سب سے کم ہے اس کے مطابق آپ سزا دیا کریں (چنانچہ سب سے خفیف حد حد قذف ہے جو اسّی کوڑوں پر مشتمل ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے پر عمل کرتے ہوئے شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے مقرر کر دیے۔''

مذکورہ بالا روایت میں شراب نوشی کی چالیس کوڑے سزا کی نسبت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف کی گئی ہے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بلا تعیین شرابی کو جوتوں اور کھجور کی شاخوں سے مارنے کا ذکر ہے۔ اس لیے امام ابوداؤد نے روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہی روایت **ابن ابی عروبه عن قتادة عن النبی** ﷺ کے واسطے سے بھی مروی ہے اور اس میں چالیس کوڑے مارنے کی نسبت بجائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

قال ابوداؤد : رواه ابن ابی عروبة عن قتادة عن النبی ﷺ انه جلد بالجريد والنعال اربعين(۷۳)
''رسول اللہ ﷺ نے کھجور کی شاخ اور جوتوں سے شرابی کو چالیس ضربیں لگائیں۔''
ورواه شعبة عن قتادة عن انس عن النبی ﷺ قال :ضرب بجريدتين نحو اربعين(۷٤)
''رسول اللہ ﷺ نے کھجور کی دو شاخیں لے کر تقریباً چالیس ضربیں لگائیں۔''

اس حدیث میں مذکور ''ضرب بجريدتين نحو اربعين'' کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ جو حضرات شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے مانتے ہیں وہ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ دونوں شاخیں الگ الگ لے کر ان دونوں سے مجموعی طور پر چالیس ضربیں لگائیں۔ ایک شاخ سے بیس اور دوسری شاخ سے بھی بیس۔ یا ایک شاخ سے پچیس اور دوسری شاخ سے پندرہ۔ اور جو حضرات اسی کوڑوں کے قائل ہیں وہ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دونوں شاخیں ایک ساتھ لے کر اس سے چالیس ضربیں لگائیں جن کا مجموعہ اسّی بنتا ہے۔

ورواه هشام عن قتادة عن انس ان النبی ﷺ كان يضرب فی الخمر بالنعال والجريد اربعين ..... (۷۵)

..... حصين بن المنذر الرقاشی هو ابوساسان قال:شهدت عثمان بن عفان وأتی بالوليد بن عقبة فشهد عليه حمران (ابن ابان) ورجل آخر فشهد احدهما أنه رأه شربها يعنی الخمر وشهد الآخر أنه رأه يتقيؤها' فقال عثمان انه لم يتقيؤها حتی شربها' فقال لعلی: اقم عليه الحد' فقال علی للحسن: أقم عليه الحد' فقال الحسن: وَلِّ حارها من تولی قارها' فقال علی لعبد اللّٰه بن جعفر :أقم عليه الحد' فاخذ السوط فجلده وعلی يعده فلما بلغ اربعين قال حسبك ' جلد النبی ﷺ اربعين' أحسبه قال: وجلد ابوبكر اربعين وعمر ثمانين' وكل سنة وهذا احب اِلیَّ (۷٦)

''حصین بن المنذر الرقاشی (ابوساسان) کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس میری موجودگی میں ولید بن عقبہ کو لایا گیا۔ اس کے خلاف حمران بن ابان (حضرت عثمان کا آزاد کردہ غلام) اور ایک دوسرے شخص نے گواہی دی۔ ایک شخص نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اس کو شراب پیتے ہوئے دیکھا ہے اور دوسرے نے گواہی دی کہ میں نے اس کو شراب قے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شراب کی قے شراب پیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس پر حد قائم کرنے کا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حد قائم کرنے کا کہا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یہ مشکل کام اسے ہی سونپیے جو اس ذمہ داری کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہو۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے اس پر حد قائم کرنے کا کہا۔ تعمیل حکم میں انہوں نے کوڑا لیا اور مارنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوڑے شمار کرتے رہے۔ جب چالیس کوڑے پر نوبت پہنچی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کافی ہے''۔ (صحیح مسلم میں حسبك کے بجائے ''امسك'' کے الفاظ ہیں) اور پھر فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے چالیس کوڑے مارے''۔ راوی کہتا ہے کہ میرا گمان ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی معمول یہی تھا' لیکن عمرؓ نے اسی کوڑے مارے' اور (چالیس کوڑے اور اسی کوڑے) دونوں سنت سے ثابت ہیں اور یہ (چالیس کوڑے) مجھے زیادہ محبوب ہے۔''

چالیس کوڑوں کے قائلین نے ''وکل سنة'' کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ چالیس کوڑے مارنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اسی پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل تھا' جبکہ چالیس پر اضافہ کر کے اسی کوڑے مارنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شراب نوشوں نے چالیس کوڑوں کی سزا کو معمولی سمجھ لیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سزا میں چالیس کوڑوں کا اضافہ شراب نوشی سے انہیں روکنے کے لیے کیا تھا۔ یہ مفہوم ابن حجر نے بیان کیا ہے' جبکہ علامہ نووی نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

((وکل سنة)) معناه ان فعل النبی ﷺ وابی بکر سنة یعمل بها وکذا فعل عمر ولکن فعل النبی ﷺ وابی بکر احب اِلیَّ۔ قوله ((وهذا احب اِلَیَّ)) اشارة الی الاربعین التی کان جلدها وقال للجلاد "اَمْسِكْ" ومعناه هذا الذی قد جلدته وهو الاربعون احب الی من الثمانین' وفیه ان فعل الصحابی سنة یعمل بها وهو موافق لقوله علیه السلام: ((فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ عُضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ))(۷۷)

''وکل سنة'' کا معنی یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل سنت ہے' جس پر عمل کیا جائے گا اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی سنت اور واجب الاتباع ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل مجھے زیادہ محبوب ہے۔ ان کے ارشاد ''وهذا حب اِلَیَّ'' سے اشارہ چالیس کوڑوں کی طرف ہے جو جلاد نے مارے اور جس پر پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مزید مارنے سے روکتے ہوئے فرمایا تھا ''رُک جاؤ!'' ان کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو چالیس کوڑے تم نے مارے وہ مجھے اسی کوڑے مارنے سے زیادہ محبوب ہیں''۔ ان کے اس ارشاد سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ کسی صحابی کا عمل بھی قابل اتباع سنت ہے جس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: ''تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل پیرا رہو۔ اس کو اپنی داڑھوں کے ساتھ مضبوط پکڑ لو!''

حاصل یہ کہ شراب نوشی کی حد چالیس کوڑے ہے' جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح ہے:

ان النبی ﷺ کان یضرب فی الخمر بالنعال والجرید اربعین

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس پر مزید جو چالیس کوڑوں کا اضافہ کیا گیا وہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے اور تعزیری سزا امام وقت کی رائے پر منحصر ہوتی ہے' مصلحت کا تقاضا ہو تو دے دے' نہ ہو تو نہ دے۔ اگر دینے میں مصلحت ہو تو دے دے اور نہ دینے میں مصلحت ہو تو چھوڑ دے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو چالیس کوڑے سے زیادہ کوڑے (تعزیر) لگانے میں مصلحت نظر نہیں آئی لہٰذا انہوں نے چالیس کوڑے ہی لگائے۔ یعنہ یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ بہر حال چالیس کوڑے تو وہ متعین حد ہے جن کا لگانا لازمی ہے۔ اگر چالیس کوڑوں پر اضافہ بھی حد میں شامل ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسی کوڑے لگانے کے بعد) حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو کبھی نہ چھوڑتے۔ اسی لیے تو ولید بن عقبہ کو چالیس کوڑے لگانے کے بعد آپؓ نے فرمایا تھا ''اَمْسِكْ''۔ ''و كل سنة'' یعنی چالیس تک محدود رہنا اور اسی تک پہنچانا دونوں سنت ہیں۔

نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں شرابی کو کبھی چالیس کوڑے مارتے اور اگر یہ محسوس کرتے کہ اس کی اصلاح چالیس کوڑوں سے نہیں ہوگی تو تعزیراً مزید چالیس کوڑے مارتے تھے۔ اگر یہ چالیس کوڑے بھی حد کا حصہ ہوتے تو وہ کبھی بھی چالیس کوڑوں پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ہر شرابی کو اسی کوڑے ہی مارتے۔

تیسرا قول

تیسرا قول جمہور علماء کا ہے۔ علامہ نووی نے لکھا ہے:

ونقل القاضی عن الجمهور من السلف والفقهاء منهم مالك وابوحنيفة والاوزاعی والثوری واحمد واسحاق رحمهم الله تعالى انهم قالوا :حده ثمانون (۷۸)

''قاضی عیاض نے امام مالک' امام ابوحنیفہ' امام اوزاعی' سفیان ثوری' امام احمد اور اسحاق بن راہویہ جیسے جمہور فقہاء اور سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ شراب نوشی کی حد کے اسی کوڑوں کے قائل تھے۔''

اور علامہ شوکانی نے لکھا ہے:

وقد ذهبت العترة ومالك والليث وابوحنيفة واصحابه والشافعی فی قول له الی ان حد السكران ثمانون جلدة' وذهب احمد وداوٗد وابوثور والشافعی فی المشهور عنه الی انه اربعون (۷۹)

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد' امام مالک' لیث بن سعد' امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگرد (ابو یوسف و محمد وغیرہ) امام شافعی (ایک قول کے مطابق) کا قول ہے کہ شراب نوشی کی حد اسی کوڑے ہیں' جبکہ امام احمد' داؤد ظاہری' ابوثور اور امام شافعی (مشہور قول کے مطابق) کا قول ہے کہ شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے ہیں۔

علامہ نووی نے امام احمد کو امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے ساتھ جبکہ علامہ شوکانی نے ان کو امام شافعی کے ساتھ شمار کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے لکھا ہے:

والعمل علی هذا عند اهل العلم من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان حد السكران ثمانون(۸۰)

اور امام ابوداؤد نے بواسطہ اسامہ بن زید عن الزہری عبدالرحمٰن بن ازہر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خط (جس میں عوام کے شراب نوشی میں انہماک اور اس کی سزا کو حقیر جانتے ہوئے جری ہونے کا ذکر کیا گیا تھا) کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین اولین سے مشورہ کیا اور اس کے نتیجے میں شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے ہونے پر ان کا اجماع ہو گیا۔

واجمعوا علی ان یضرب ثمانین (۸۱)

اور ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح میں لکھا ہے:

أجمع عليه الصحابة فلا يجوز لأحد المخالفة (۸۲)

صاحبِ ہدایہ نے لکھا ہے:

وحد الخمر والسكر فى الحر ثمانون سوطاً لاجماع الصحابة رضى اللّٰه عنهم (۸۳) **(أى فى عهد عمر)**

عبدالرحمٰن الجزیری نے لکھا ہے:

اختلفوا فى مقدار حد الشرب المالكية والحنفية والحنابلة يقولون أنه ثمانون جلدة لان عمر قدره بثمانين جلدة ووافقه عليه الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين۔ الشافعية يقولون انه اربعون جلدة لانه هو الثابت عن النبى ﷺ (۸۴)

''شراب نوشی کی حد کی مقدار میں اختلاف ہے۔ مالکیہ' حنفیہ اور حنابلہ اسی کوڑوں کے قائل ہیں' کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے مقرر کیے تھے اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس پر اتفاق ہو گیا تھا۔ اور شافعیہ کے نزدیک چالیس کوڑے ہیں' کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے چالیس کوڑے ہی ثابت ہیں۔''

اصل بات یہ ہے کہ شراب نوش کو نفس کوڑے لگانے کا حکم رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ مشہور حدیث ہے: ((مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ فَاجْلِدُوْهُ فَإِنْ عَادَ فِي الرَّابِعَةِ فَاقْتُلُوْهُ'' (۸۵) لیکن کوڑوں کی متعین مقدار رسول اللہ ﷺ کے کسی قول مبارک (حدیث قولی) سے تو ثابت نہیں' البتہ آپ ﷺ کے فعل سے اس کا ثبوت ہے' جیسا کہ عبدالرزاق نے حسن سے روایت کیا ہے:

هم عمر ان يكتب فى المصحف ان رسول اللّٰه ﷺ ضرب فى الخمر ثمانين (۸۶)

ابن ابی شیبہ نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے:

ان رسول اللّٰه ﷺ ضرب فى الخمر بنعلين اربعين فجعل عمر مكان كل نعل سوطا (۸۷)

امام محمد نے کتاب الآثار میں بطریق ذیل نقل کیا ہے:

اخبرنا ابوحنيفة حدثنا عبدالكريم بن ابى المخارق يرفع الحديث الى النبى ﷺ انه اتى بسكران فامرهم ان يضربوه بنعالهم' وهم يومئذ اربعون رجلاً فضرب كل احد بنعليه (۸۸)

واخرج عبدالرزاق عن ابى سعيد الخدرى ان ابابكر الصديق ضرب فى الخمر بالنعلين اربعين

امام ترمذی نے بھی اس سلسلے میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کر کے اسے حسن میں شمار کیا ہے جو درج ذیل ہے:

ان رسول اللّٰه ﷺ ضرب فى الخمر بنعلين اربعين (۸۹)

عن انس ان النبى ﷺ اتى برجل قد شرب الخمر فجلد بجريدتين نحو اربعين قال وفعله ابوبكر' فلما كان عمر ..... (۹۰)

مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے شرابی کو بطور سزا اسّی جوتے اور کھجور کی شاخیں بھی ماری ہیں۔ انہی روایات کی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کی تجویز پر کبارِ صحابہؓ کے اتفاق سے اسّی کوڑے مارے گئے اور اسی پر اجماع ان کا اجماع منعقد ہو گیا' جیسا کہ درج ذیل روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

عن انس ان النبی ﷺ اتی برجل قد شرب الخمر فجلد بجریدتین نحو اربعین قال : وفعله ابوبکرؓ فلما کان عمرؓ استشار الناس فقال عبدالرحمن بن عوف اخف الحدود ثمانین فأمر به عمر

مندرجہ بالا فعلی روایات کو بنیاد بنا کر صحابہ کرام کی مشاورت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شراب نوشی کی سزا اسّی کوڑے ہونے پر ان کا اجماع ہو گیا۔

عن السائب بن یزید قال کنا نؤتی بالشارب علی عهد رسول الله ﷺ وامرة ابی بکر فصدرًا من خلافة عمر فنقوم الیه بایدینا ونعالنا واردیتنا' حتی کان آخر امرة عمر فجلد اربعین' حتی اذا عتوا وفسقوا جلد ثمانین (۹۱)

''سائب بن یزید کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پورے دورِ خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آغاز میں جب کوئی شرابی لایا جاتا تھا تو ہم اسے ہاتھوں' (گھونسوں) جوتوں اور چادر کے بنے ہوئے کوڑے سے مارتے تھے' حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری دور خلافت میں شراب نوشی کے سلسلے میں لوگوں کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے لگانے شروع کیے۔''

صحیح بخاری کی اس حدیث سے دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زمانہ نبوت' خلافت ابوبکرؓ اور خلافتِ عمرؓ کے آخری دور تک شراب نوشی کی کوئی متعین سزا نہیں تھی۔ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت عمرؓ کے آخری دور خلافت میں متعین ہوئی۔ حالانکہ متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی نافذ تھی۔ چنانچہ امام مالک نے مؤطا میں ثور بن یزید سے نقل کیا ہے:

ان عمر استشار فی الخمر فقال له علی بن ابی طالب نری ان تجعله ثمانین

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہماری رائے یہ ہے کہ آپ اس کو اسّی کوڑے لگائیں۔''

امام نسائی اور طحاوی نے بطریق یحییٰ بن فلیح عن ثور عن عکرمۃ عن ابن عباس اس کو موصول اور مطول بھی بیان کیا ہے کہ:

ان الشراب کانوا یضربون علی عهد رسول الله ﷺ بالایدی والنعال والعصا' حتی توفی' فکانوا فی خلافة ابی بکر اکثر منهم' فقال ابوبکر لو فرضنا علیهم حدا ..... فجلدهم اربعین' حتّٰی توفی' ثم کان عمر فجلدهم کذٰلك' حتی اتی برجل وذکر قصة

..... وانه تأول قوله تعالٰی ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾ وان ابن عباس ناظره واحتج ببقية الآية وهو قوله تعالٰی ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا﴾ والذی یرتکب ما حرمه اللّٰه لیس بمتقٍ' فقال عمر :ماترون؟ فقال علی :فذکره وزاد بعد قوله: اذا هذی افتری وعلی المفتری ثمانون جلدة' فامر به عمر فجلده ثمانین

''شراب نوشوں کو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہاتھوں' جوتوں اور لاٹھیوں سے مارا جاتا تھا' حتیٰ کہ آپ ﷺ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب شرابیوں کی کثرت ہوگئی تو انہوں نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: اگر ہم ان پر کوئی حد (سزا) مقرر کریں ..... لہٰذا آپ اپنی وفات تک چالیس کوڑے ان کو مارتے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا' حتیٰ کہ ایک آدمی لایا گیا جو ارشادِ ربانی ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کی غلط تاویل کر کے شراب نوشی کا جواز ثابت کرتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے مناظرہ کرتے ہوئے آیت کریمہ کے آخری حصہ ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا﴾ کو شراب نوشی کی حرمت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی حرام کردہ شے کا ارتکاب کرے وہ متقی کیسے ہوسکتا ہے؟ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ما ترون؟ یعنی شراب نوشی کی سزا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب کوئی شراب پیے گا تو اسے نشہ چڑھے گا' جب نشہ چڑھے گا تو ہذیان بکے گا' اور جب ہذیان بکے گا تو کسی پر تہمت بھی لگائے گا' اور تہمت لگانے کی سزا اسی کوڑے ہے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس رائے کی بنیاد پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کوڑے مقرر کر دیے''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اثر کے مذکورہ بالا طریق کے علاوہ اور بھی طرق ہیں۔ چنانچہ طبرانی' طحاوی اور بیہقی نے بواسطہ اسامه بن زید عن الزهری عن حمید بن عبدالرحمٰن نقل کیا ہے:

ان رجلا من بنی کلب یقال له ابن دبرة اخبره ان ابابکر کان یجلد فی الخمر اربعین وکان عمر یجلد فیها اربعین' قال فبعثنی خالد بن الولید الی عمر ' فقلت :ان الناس قد انهمکوا فی الخمر واستخفوا العقوبة' فقال عمر لمن حوله ما ترون؟ قال ووجدت عنده علیا وطلحة والزبیر وعبدالرحمن فی المسجد فقال علی .....

عبدالرزاق نے یہی اثر عن معمر عن ایوب عن عکرمه نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

ان عمر شاور الناس فی الخمر فقال له علیؓ ان السکران اذا سکر هذی .....

ابن ابی شیبہ نے بواسطه ابی عبدالرحمن السلمی عن علی ..... قال شرب نفر من اهل الشام الخمر وتاولوا الآیة المذکورة فاستشار عمر فیهم فقلت :اری ان تستتیبهم فان تابوا ضربتهم ثمانین ثمانین والا ضربت اعناقهم لانهم استحلوا ما حرم اللّٰه ' فاستتابهم فتابوا فضربهم ثمانین ثمانین

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ شام کے کچھ لوگوں نے شراب پی اور آیت مذکورہ کی غلط تاویل کی تو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے مشاورت کی۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے توبہ کرائیں' اگر وہ توبہ تائب ہو گئے تو انہیں اسّی اسّی کوڑے ماریں' بصورت دیگر ان کی گردنیں اڑائیں' کیونکہ انہوں نے اللہ کی حرام کردہ شے کو حلال سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں توبہ کرنے کو کہا تو انہوں نے اپنے اس طرزِ عمل پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کر لی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اسّی اسّی کوڑے لگائے۔

ابوداؤد اور نسائی کی روایت بواسطہ عبدالرحمٰن بن ازھر میں ہے:

..... **فلما كان عمر كتب اليه خالد بن الوليد ان الناس قد انهمكوا في الشرب وتحاقروا العقوبة' قال وعنده المهاجرون والانصار فسألهم واجتمعوا على ان يضربهم ثمانين** .....

''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو خالد بن الولید نے انہیں خط لکھا کہ شراب نوشی میں لوگوں کا انہماک بڑھ گیا ہے اور اس کی مقرر کردہ سزا کو وہ حقیر سمجھنے لگے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت (خط پہنچنے کے وقت) مہاجرین وانصار آپ کے پاس تشریف فرما تھے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس بارے میں سوال کیا' جس کے نتیجے میں ان کا اسی کوڑے لگانے پر اتفاق ہو گیا۔''

عبدالرزاق نے بواسطہ ابن جریج و معمر ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے:

فرض ابوبكر في الخمر اربعين سوطا وفرض فيها عمر ثمانين

ان روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کوڑوں کی سزا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی نافذ تھی۔ دوسری بات جو صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں شراب نوش کی کوئی متعین سزا نہیں تھی' حالانکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت جو احمد' مسلم' ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کی ہے اور جس کو ہم اوپر نقل کر کے آئے ہیں جس کے الفاظ ''**فجلد بجريدتين ' نحو اربعين**'' کے الفاظ ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسّی کوڑے مارے تھے۔

مندرجہ بالا روایات و آثار سے خلافت فاروقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجویز پر حد شرب کے اسّی کوڑے ہونے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ظاہر ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ ان روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسّی کوڑے کے محرک حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے' لیکن جیسا کہ ہم نے ماسبق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: ''**لان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يسن فيه شيئا**'' تو ان کے اس قول کا مفہوم یہ ہے: **اى لم يعين فى الحد مقداراً يبلغ ثمانين "انما هو" اى مقدار حد الخمر وهو ثمانون شيئا "قلناه نحن۔**'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد شرب میں کوڑوں کی کوئی معیّن مقدار' جو اسّی تک پہنچتی ہو' مقرر نہیں فرمائی' حد خمر کی مقدار اسّی کوڑے ہم نے مقرر کیے ہیں۔ یہ معنی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرابی کو کوئی سزا ہی نہیں دی' کیونکہ ماسبق میں بہت ساری روایات میں شرابی کو مارنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حکم مذکور ہوا ہے۔ مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں معیّن مقدار میں کوڑوں کی سزا نہیں تھی۔ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ابتدائی دور میں چالیس کوڑے مقرر کیے گئے۔ بعدازاں جب لوگ اس سلسلے میں حد سے بڑھنے

لگے اور چالیس کوڑوں کی سزا ان کو شراب نوشی سے نہ روک سکی تو باہمی مشاورت اور حضرت علی اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما کی تجویز پر اسّی کوڑے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو گیا۔

اسّی کوڑوں پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کے مدعی جمہور فقہاء پر اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجویز پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسی کوڑوں پر ان کا اجماع ہو گیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے اخیافی بھائی ولید بن عقبہ پر عبداللہ بن جعفرؓ کے حد لگانے کے دوران چالیس کوڑے لگانے پر اجماع کی مخالفت کرتے ہوئے انہیں حضرت علیؓ نے کیوں ''حسبك'' یا ''امسك'' کہہ کر روکا تھا؟ اور آخر کیا وجہ تھی کہ انہوں نے ایک اجماعی قول کی مخالفت کی؟ اگر یہ تاویل کی جائے کہ عبداللہ بن جعفر نے جس چھڑی سے ولید بن عقبہ پر حد لگائی تھی اس کے دوسرے تھے اور اس طرح چالیس مارنے پر اس کی تعداد پوری ہو گئی تھی تو یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ اگر اس طرح اسّی کی تعداد پوری ہو گئی تھی تو آخر حضرت علیؓ کو مداخلت کر کے عبداللہ بن جعفر کو کیوں روکنا پڑا جبکہ اسّی کی تعداد پوری ہونے کی صورت میں مزید مارنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

مزید برآں عبداللہ بن عبدالرحمٰن کی روایت جو ہم ابوداؤد کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں اس میں شراب نوشی کی سزا کے سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل ''**جلد عثمان الحدين كليهما ثمانين واربعين**'' بیان ہوا ہے، یعنی آپ کبھی چالیس اور کبھی اسّی کوڑے مارتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ چالیس کوڑے مارتے وقت اس اجماع کی ان کی نظر میں کیا حیثیت تھی؟ انہوں نے اجماع کی مخالفت کیوں کی؟

حواشی

(۵۹) فتح الباری، کتاب الحدود، باب الضرب بالحرید والنعال، ج۱۲، ص ۸۸۔

(۶۰) نیل الاوطار، ج۷، ص ۳۱۹۔

(۶۱) الفقه علی المذاهب الاربعة، کتاب الحدود، القسم الاول حد شرب الخمر، ج۵، ص ۲۲۔

(۶۲) سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فی الحد فی الخمر۔

نوٹ: ''**لم يقت فى الخمر حدا**'' کا معنی یہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی کی بالکل کوئی حد مقرر ہی نہیں کی اور آپ کے بعد صحابہ کرامؓ نے اپنی رائے سے حد متعین کی ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے معیّن مقدار میں کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی، بلکہ آپؐ چالیس سے اسّی کوڑے مارتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی مشاورت میں صحابہ نے سزا کا آخری درجہ (اسّی کوڑے) اتفاق رائے سے متعین فرمایا۔ باقی رہا یہ کہ حدیث میں مذکور شرابی کو آپ ﷺ نے کوئی سزا کیوں نہیں دی تو اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں: (۱) اُس وقت حد کی مشروعیت نہیں ہوئی تھی، اس کے بعد ہوئی۔ (۲) حضرت عباسؓ کے گھر میں داخل ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس سے کوئی تعرض اس لیے نہیں فرمایا کہ اس پر حد لگانے کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے تھے، کیونکہ نہ تو اس نے خود شراب نوشی کا اقرار کیا تھا اور نہ ہی اس کے خلاف سوائے اس کی لڑکھڑاتی چال کے کوئی گواہ موجود تھا۔ لہٰذا آپؐ نے اس کی کوئی تفتیش اور تحقیق کے بجائے پردہ پوشی فرمائی۔

(٦٣) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب الضرب بالجرید والنعال۔ وصحیح مسلم' کتاب الحدود' باب حد الخمر' وسنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب اذا تتابع فی شرب الخمر۔

نوٹ: فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس پر حد واجب ہے اور دوران حد ہی اس کی موت واقع ہو جائے تو نہ اس کی دیت ہے اور نہ ہی حد لگانے والے پر کوئی کفارہ ہے۔ اور جو شخص دوران تعزیر مر جائے تو اس بارے میں امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ دیت اور کفارہ دونوں واجب ہیں' البتہ دیت اور کفارہ کس پر ہے اس بارے میں امام شافعی کے دو قول ہیں۔ صحیح قول یہی ہے کہ دیت کی ادائیگی امام کے عاقلہ اور کفارہ امام وقت پر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دیت کی ادائیگی تو بیت المال سے ہوگی اور کفارہ کے بارے میں دو قول ہیں (۱) بیت المال سے ادائیگی (۲) امام وقت کے مال سے اس کی ادائیگی۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ تعزیری سزا کے نتیجے میں مرنے والے کا کوئی ضمان نہیں' نہ امام وقت پر نہ جلاد پر اور نہ ہی بیت المال پر۔ المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج' کتاب الحدود' باب حد الخمر الجزء الحادی عشر' ص ۲۱۸۔

(٦٤) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب الضرب بالجرید والنعال۔

(٦٥) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب الضرب بالجرید والنعال۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الحدود ' باب فی الحد فی الخمر۔

(٦٦) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب من امر بضرب الحد فی البیت۔

نوٹ: ابن عبدالبر کا کہنا ہے' ان الذی کان اتی به قد شرب الخمر هو ابن النعیمان فانه قیل فی ترجمة النعیمان : کان رجلا صالحا وکان له ابن انهمك فی شرب الخمر فجلده النبی ﷺ وقال فی موضع آخر اظن أنّ ابن النعیمان جلد فی الخمر اکثر من خمسین مرة : فتح الباری' الجزء الثانی عشر کتاب الحدود' باب من امر یضرب الحد فی البیت۔

(٦٧) نیل الاوطار' الجزء السابع' الدلیل علی مشروعیة حد الشرب' ص:۳۱۹۔

(٦٨) صحیح البخاری' کتاب الحدود' باب الزنا وشرب الخمر۔

نوٹ: شراب نوشی کی سزا میں کوڑوں کے استعمال کے بارے میں تین مذاہب ہیں: (۱) کوڑے مارنا بھی صحیح ہے اور گھونسوں' جوتوں اور کپڑے کے کوڑے مارنا بھی صحیح ہے۔ (۲) صرف کوڑے ہی لگائے جائیں گے۔ (۳) صرف مار پیٹ ہی متعین ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کوڑے نہیں مارے جاتے تھے بلکہ شرابی کی مار پیٹ ہی ہوتی تھی۔ کوڑے لگانے کا عمل صحابہ کرامؓ (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کے دور میں ہوا ہے لہٰذا کوڑے مارنے کا صرف جواز ہے' یعنی پہلا قول راجح ہے۔

(٦٩) صحیح مسلم' کتاب الحدود' باب حد الخمر۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب فی الحد فی الخمر۔

(۷۰) نوٹ : مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسّی کوڑے لگانے کی تجویز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے سامنے آئی تھی' جبکہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت جو صحیح مسلم کے حوالے سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف سے آئی تھی۔ ہوسکتا ہے دونوں طرف سے یہ تجویز سامنے آئی ہو۔

(۷۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب اذا تتابع فی شرب الخمر۔

(۷۲) سنن ابی داوٗد، کتاب الحدود، باب فی الحد فی الخمر۔ وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر۔

سنن ابی داؤد اور صحیح مسلم کی روایات میں اسّی کوڑوں کی رائے دینے والے صحابی کا نام عبدالرحمٰن بن عوف مذکور ہے جبکہ مؤطا امام مالک میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام مذکور ہے۔ نووی نے لکھا ہے کہ دونوں صحیح ہیں، ہوسکتا ہے کہ دونوں نے یہ مشورہ دیا ہو۔ آغاز عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا ہو اور بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی موافقت کی ہو، لہٰذا کسی روایت میں سبقت کی وجہ سے اس رائے کی نسبت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف اور فضیلت، کثرتِ علم اور راجح ہونے کی وجہ سے کسی روایت میں اس رائے کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی گئی ہو۔

(۷۳) ایضاً۔ وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر۔

(۷٤) ایضاً۔ وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر۔ وصحیح البخاری، کتاب الحدود، باب ما جاء فی ضرب شارب الخمر۔ وسنن الترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء فی حد السکران۔

(۷٥) صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر۔

(۷٦) سنن ابی داوٗد، کتاب الحدود، باب الحد فی الخمر۔ وصحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر۔ وسنن ابن ماجه، کتاب الحدود، باب حد السکران۔

(۷۷) المنهاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، الجزء الحادی عشر، ص ۲۱٤۔

نوٹ: صحیح مسلم، ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ولید بن عقبہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے مروائے تھے، جبکہ صحیح بخاری کی روایت عبداللہ بن عدی بن الخیار میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو چالیس کی بجائے اسّی کوڑے مارے تھے، جبکہ واقعہ بھی ایک ہی ہے۔ قاضی عیاض نے اس کا دفعیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ شراب نوشی کی سزا کے سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور مذہب اسی کوڑے کا ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے ''**فی قلیل الحد و کثیرها ثمانون جلدة**'' نیز انہوں نے نجاشی کے نام سے مشہور شخص کو بھی اسّی کوڑے مارے تھے۔ مزید برآں اسّی کوڑے مارنے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، جیسا کہ موطا امام مالک کی روایت میں ہے۔ بنابریں اسی کوڑے لگانے کی روایت کو چالیس کوڑے مارنے کی روایت پر ترجیح حاصل ہوگی۔

علاوہ ازیں صحیح مسلم وغیرہ کی روایت اور صحیح بخاری کی روایت میں جمع وتطبیق کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ کو جس کوڑے سے مارا تھا اس کے دوسرے ہوں اور اس طرح مجموعی کوڑے اسی بنتے ہیں۔ اور ''**هذا احب الیّ**'' میں اشارہ اسّی کوڑوں کی طرف ہے اور ان کے فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ اسّی کوڑے بنسبت چالیس کوڑے مجھے زیادہ محبوب ہیں۔'' (النووی، الجزء الحادی عشر، ص ۲۱۷)

(۷۸) المنهاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، کتاب الحدود، باب حد الخمر، الجزء الحادی عشر، ص ۲۱٤۔

(۷۹) نیل الاوطار، کتاب الحدود، المجلد الرابع، الدلیل علی مشروعیة حد الشرب، ص ۳۱۹۔

(باقی صفحہ 28 پر)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: حافظ محمد زبیر

(۱)

نام کتاب : مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ: حیات وخدمات

مؤلفین : ڈاکٹر صہیب حسن، ڈاکٹر سہیل حسن

ناشر: محمد سرور عاصم اشاعت: دسمبر ۲۰۱۰ء، صفحات: ۵۹۷، قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلامیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، فون: 042-37244973

مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کا شمار عصر حاضر کے نامور اور معروف علمائے محدثین میں ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بعنوان ''مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ: حیات وخدمات'' ان کے حالاتِ زندگی، تذکرۂ ایام اور سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک عالمِ دین اور مردِ مجاہد کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ایک عالم کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب پیش لفظ، تین حصوں اور ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ

کتاب کے پہلے حصہ میں مولانا عبدالغفار حسن صاحبؒ کے خاندان، ابتدائی تعلیم وتربیت، جماعتِ اسلامی سے وابستگی کے سولہ سال، مدینہ یونیورسٹی میں بطور مدرس ۱۶ سال قیام، اسلامی نظریاتی کونسل کے نو سال اور ان کے غیر ملکی اسفار کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس حصہ میں ان کے نامور مشائخ اور شاگردوں کا بھی تعارف کروایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں نامور علماء، معروف مشائخ اور مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مولانا کی ملاقاتوں، تعلقات اور یادداشتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ نے جماعتِ اسلامی میں تقریباً ۱۶ سال گزارے اور بعد ازاں مولانا مودودی رحمہ اللہ سے کچھ اصولی اختلافات کی وجہ سے جماعت سے علیحدہ ہوگئے۔ مولانا نے جماعت سے اپنی علیحدگی کے تین اسباب کا ذکر کیا ہے:

> ''میں نے اپنے استعفا کے تین اسباب لکھے تھے: ۱۔ انقلابِ قیادت کا نعرہ اور الیکشن کی مہم جماعت کی اصل بنیادی پالیسی کے خلاف ہے بلکہ صریحاً اس سے انحراف ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کا مقالہ ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' اور ''تجدید واحیاءِ دین'' میں ''سید احمد شہید رحمہ اللہ کی ناکامی کے اسباب'' کے عنوان سے جو تحریر درج ہے، دونوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۵۱ء سے جماعت نے فکری انقلاب اور اصلاح معاشرہ کے بجائے انقلابِ قیادت یا سیاسی انقلاب کا راستہ اپنایا ہے، نتیجہ

واضح ہے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ۔۲۔ ترجمان القرآن دسمبر ۵۶ء میں پریکٹیکل وزڈم کے بارے میں جو مقالہ شائع ہوا ہے وہ یکسر قرآن وسنّت کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک سیاسی دین ہے' یعنی دین' سیاست کے تابع ہے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہونا چاہیے' یعنی ہمیں 'سیاسی دین' کی بجائے 'دینی سیاست' کی ضرورت ہے' جس میں سیاست دین کے تابع ہو۔ ۳۔ امیر جماعت کی طرف سے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے نام جو نوٹ ارسال کیا گیا تھا وہ اسلامی عدل اور جمہوری تقاضوں کے یکسر خلاف تھا۔'' (ص ۱۶۳۔۱۶۴)

اگرچہ بعض اہلِ حدیث علماء مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ سے یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ جماعت اسلامی کی رکنیت کی وجہ سے اپنا اہلِ حدیث ہونے کا تشخص برقرار نہ رکھ سکے تھے' لیکن مولانا ان اہل حدیث علماء کی اس نقد سے متفق نہیں ہیں۔ ایک جگہ ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

''سوال: کیا آپ جماعت اسلامی میں رہ کر مسلک اہلِ حدیث پر قائم رہے؟

جواب: جماعتِ اسلامی میں میرا اہلِ حدیث تشخّص قائم رہا' نعیم صدیقی صاحب سے بعض اوقات بحث ہو جاتی تھی۔ وہ کہتے تھے رفع الیدین چھوڑ دو' کیا حرج ہے۔ میں نے کہا داڑھی کیوں نہیں بڑھاتے' داڑھی کٹا کر خود سنت کی خلاف ورزی کرتے ہو اور ہمیں کہتے ہو رفع الیدین نہ کریں۔ میں نے مولانا مودودی سے ان کے مسلکِ اعتدال کے بارے میں باقاعدہ بحث کی ہے' مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ فقہ کا مسلک' محدثین کے مسلک سے قوی ہے۔ میں نے اس پر بحث کی خط وکتابت کے ذریعے' وہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ نعیم صدیقی صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ کارکنان کو مسلک اعتدال کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔ میں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہاں اہل حدیث بھی ہیں' حنفی بھی ہیں' مسلکِ اعتدال خالص مولانا مودودی کا نظریہ ہے' ہم سب اس کے حامی نہیں ہیں۔ اس لیے مسلکِ اعتدال کی تبلیغ یہاں نہیں ہوسکتی۔ میں نے فروعی مسائل جو حدیث کے خلاف ہیں ان کو بھی نہ مانا' باقاعدہ جماعت کی تربیت گاہوں میں اعلان کرتا رہا کہ ہم مسلک اعتدال کو نہیں مانتے۔ بڑی جھڑپیں ہوئیں' بڑی بحثیں ہوئیں' میں نے بہت کچھ برداشت کیا۔ میں نے جماعت کے مرکز میں رہ کر اہلِ حدیث تشخّص کو برقرار رکھا۔'' (ص ۴۴۳)

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ نے اپنی زندگی کے ۱۶ سال مدینہ یونیورسٹی میں تدریس کرتے ہوئے گزارے۔ مدینہ منوّرہ کے قیام کے دوران تقریباً تمام مسالک کے علماء سے ان کی ملاقات رہتی تھی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''میرے مدینہ کے قیام کے دوران جن لوگوں سے تجدید ملاقات ہوئی ان میں شامل ہیں: مولانا عبداللہ بہاولپوری' مولانا عطاء اللہ حنیف' شیخ عبداللہ کشمیری' ارشاد الحق حقانی' احسان الٰہی ظہیر' عبدالاحد ملتستانی اور علماء سعودیہ میں سے شیخ محمد بن سبیل' شیخ حمید' شیخ عبدالعزیز بن صالح' شام کے محمد المبارک اور مصطفیٰ الزرقاء سے ملاقات رہی۔ جو حضرات میری دعوت پر گھر تشریف لائے ان میں چند ایک نام یہ ہیں: مفتی محمد شفیع' تقی عثمانی' شہابیہ سیالکوٹ کے محمد علی' مولانا غلام اللہ' مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا عبید اللہ

مبارکپوری، مولانا مختار احمد ندوی، مفتی محمود، حکیم عبدالرحیم اشرف، ڈاکٹر اسرار احمد، چچا عبدالوکیل خطیب، مولانا ابوالحسن ندوی، مولانا منظور نعمانی، مولانا سمیع الحق۔'' (ص ۱۹۳۔۱۹۴)

مدینہ کے قیام کے دوران انہوں نے مشقت اور تکالیف میں انتہائی صبر کا مظاہرہ کیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ قیام کے دوران کوئی تیرہ کے قریب کرائے کے مکان بدلے ہوں گے:

''میں نے سولہ سال میں کوئی تیرہ مکان بدلے ہوں گے، سوائے ایک مالک مکان کے سب کے ہاں وعدہ خلافی پائی اور یہ مالک مکان بخاری تھے، اوپر نیچے کا مکان تھا، غالباً گارے کی دیواریں تھیں۔ فرش میں اکثر بچھو دیکھے، یہاں تک کہ مکان میں بلی کے بچے تھے جنہیں ان بچھوؤں نے کاٹ ڈالا۔ ایک دفعہ تعطیل گزار کر آئے تو دیکھا کہ سب کتابوں کو دیمک لگ چکی ہے۔ میزان الاعتدال اور نصب الرایہ دونوں کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کا ''پوتے کی میراث'' کے موضوع پر ایک قلمی نسخہ تھا۔ شیخ عبدالکریم مراد نے مانگا بھی لیکن میں نے نہیں دیا۔ وہ 'معارف' میں چھپنے کے لیے بھیجا لیکن انہوں نے شائع نہیں کیا اور یہاں وہ دیمک کی نذر ہو کر رہ گیا۔ اس مکان کو قبل از وقت خالی کر دیا تو مالک مکان نے باقی مدت کا کرایہ واپس کر دیا۔'' (ص ۱۹۴)

ان کے مدینہ یونیورسٹی کے شاگردوں میں سے علامہ احسان الٰہی ظہیر، شیخ ضیاء الرحمٰن اعظمی، شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق، شیخ ربیع ہادی المدخلی، شیخ عبدالقادر حبیب اللہ سندھی، مولانا حسن جان، مولانا عبدالرزاق اسکندر، ڈاکٹر سہیل حسن، حافظ عبدالسلام کیلانی، حافظ ثناء اللہ عیسیٰ خان، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار فریوائی، حافظ مسعود عالم، مولانا عبدالرحمٰن مدنی وغیرہ نمایاں ہیں۔ علاوہ ازیں شیخ عاصم الحداد، حافظ عبدالوحید سلفی، مولانا محمد بشیر سیالکوٹی، مولانا عبدالعزیز علوی، مولانا عبداللہ عفیف اور مولانا محمود احمد غضنفر وغیرہ کا شمار بھی ان کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔

جماعتِ اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے علاوہ جماعت اہلِ حدیث اور علمائے اہل حدیث کے ساتھ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کے تعلقات کی بھی ایک پوری تاریخ اس کتاب میں موجود ہے۔ مولانا اگرچہ صحیح معنوں میں منہج اہلِ حدیث پر قائم تھے، یعنی کتاب وسنت کی روشنی میں فقہا کے اقوال میں سے اقرب الکتاب والسنۃ کو اختیار کرتے تھے، لیکن وہ اہل حدیث کی انتخابی سیاست میں شمولیت اور مسلکی مسائل میں غلو کو ناپسند جانتے تھے، جس کی وجہ سے بعض اہل حدیث علماء ان سے ناراض تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''ایک دن [جسٹس] تنزیل الرحمٰن نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ آپ کے خلاف بہت سی شکایات آرہی ہیں، خاص طور پر اہل حدیث حلقوں سے کہ یہ تو اہل حدیث نہیں ہے، اسے اہل حدیث سیٹ پر کیوں نامزد کیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ انہی سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کیا وجہ ہے؟ ایک دن اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ سیاسی اور مذہبی تنظیمیں قائم کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں، میں نے اپنا نظریہ پیش کیا کہ ہر دو قسم کی تنظیمیں شرعاً ناجائز ہیں، چونکہ اس سے اُمت میں افتراق پیدا ہوتا ہے بلکہ ہو رہا ہے۔ جب میں نے یہ وضاحت کی تو جسٹس صاحب بولے کہ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کی مخالفت کیوں ہو رہی ہے؟ میرا اپنا

طریق کار یہ رہا ہے کہ ہر مسئلہ پر قرآن وحدیث کی روشنی میں غور کرتا ہوں خواہ میری تحقیق کسی مسلک کے خلاف پڑے یا موافق۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میری رائے سلفی مسلک کے خلاف ہو جاتی ہے اور کبھی حنفیہ کے خلاف۔'' (ص ۲۰۱۔۲۰۲)

ایک جگہ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کی پوتی ڈاکٹر رملہ حسن اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں دادا کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور دادا ابا کسی کی بھیجی ہوئی کتاب ''حقیقت تقلید'' دیکھ رہے تھے۔ اس کتاب کو دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے دادا ابا نے اس کا عنوان دیکھتے ہی فوراً کہا کہ جو لوگ مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کر رہے ہیں اس پر کوئی نہیں لکھتا' یہ لوگ کم از کم دین کی ہی تقلید کر رہے ہیں۔'' (ص ۳۹۹)

مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ منہج اہل حدیث پر اس قدر سختی سے قائم تھے کہ وہ غیر مقلد اور اہلِ حدیث میں بھی فرق کرتے تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''غیر مقلد عام ہے یعنی غیر مقلد تو ہر وہ شخص ہو جاتا ہے جو تقلید ترک کر دے مگر اہل حدیث اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ محدثین کے مکتبِ فکر کو اپنا لے اور عقیدہ و عمل سے لے کر قوانین وضوابط تک ہر چیز کی بنیاد کتاب وسنت پر رکھے۔ اسی لیے مولانا امین احسن اصلاحی' کسی حد تک مولانا مودودی' ڈاکٹر اسرار احمد' مولانا حنیف ندوی وغیرہ یہ لوگ غیر مقلد تو ہیں مگر اہل حدیث نہیں۔'' (ص ۵۹۰)

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد مولانا عبدالغفار حسن اور ڈاکٹر اسرار احمد رحمہما اللہ کے مابین کافی عرصہ خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ سے جب مولانا کے حوالے سے کسی قابل ذکر واقعہ کو بیان کرنے کا سوال ہوا' تو انہوں نے یہ واقعہ بیان فرمایا:

''مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ایک دن میں نے مولانا کو فیض کی یہ نظم سنائی کہ جس میں وہ کہتا ہے:
مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا' اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا۔ اس نظم کو مولانا نے بہت پسند کیا اور دوبارہ پڑھوا کر باقاعدہ ٹیپ پر ریکارڈ کرالیا۔'' (ص ۵۳۵۔۵۳۶)

مولانا اپنی یادداشتوں میں بعض معاملات میں ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کھل کر تعریف کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات ان سے کسی شکوہ کا بھی اظہار فرما دیتے ہیں۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی اس خوبی کو میں سراہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس وقت ان کے داماد (بھائی اقتدار احمد کے فرزند) کا عین جوانی کے عالم میں ایک حادثے میں انتقال ہوا تو تدفین کے موقع پر برسرِ عام اعلان کیا کہ ان کے لیے کوئی قرآن خوانی کی رسم نہیں کی جائے گی۔'' (ص ۱۸۰)

مولانا کے بقول وہ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی خواہش پر ساہیوال منتقل ہوئے تھے تاکہ ان کے قرآن ہاسٹل میں تدریس کے فرائض سرانجام دے سکیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ

کتاب کے دوسرے حصے میں مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کے بیٹوں' بہوؤں' پوتوں اور پوتیوں میں سے

خبیب حسن، سہیل حسن، راغب حسن، احمد حسن، حامد حسن، نمیر حسن، حافظ نصیر حسن، عزیر حسن، اسید حسن، اُمّ عمیر، امّ یاسر، رملہ حسن اور رفیدہ حسن نے ان کی گھریلو اور نجی زندگی کے بارے میں کافی معلومات جمع کی ہیں اور ان کے زہد، تقویٰ، حسنِ سلوک اور اخلاقِ حسنہ پر عمدہ طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکرات کو کسی صورت برداشت نہیں کرتے تھے اور فوراً اپنے ردعمل کا اظہار کر دیتے تھے۔ مولانا کے بیٹے خبیب حسن احتشام رقم طراز ہیں:

''منکرات پر غم وغصہ کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ کراچی میں اپنے کسی عزیز کے جنازے میں تشریف لے گئے، میں ساتھ تھا۔ قبرستان پہنچے تو میت دفنائی جا رہی تھی اور کچھ لوگ ایک طرف بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ انہیں سخت الفاظ میں ڈانٹا کہ یہ جگہ اپنی موت کو یاد کرنے کا مقام ہے، خوش گپیوں کا نہیں۔ رؤیت ہلال کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مختلف صوبائی حکومتوں میں جانا ہوتا۔ کراچی میں کمیٹی کا اجلاس حبیب بینک بلڈنگ میں ہوتا اور اجلاس کے بعد بینک کی طرف سے کھانے کا انتظام ہوتا، لیکن والد صاحب بینک کے سودی معاملات کی وجہ سے معذرت کر کے چلے آتے۔'' (ص ۳۱۶۔۳۱۷)

مولانا عبد الغفار حسن رحمہ اللہ کا رہن سہن سادہ تھا۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر سہیل حسن ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنی ساری زندگی میں سادگی کو اپنائے رکھا، لباس اور دیگر استعمال کی چیزوں میں کسی قسم کی فضول خرچی پسند نہیں کرتے تھے۔ سعودی عرب میں علمائے کرام اپنے لباس پر ایک مخصوص عبا پہنتے تھے جس کے کنارے پر سنہرا گوٹہ لگا ہوا ہوتا تھا، ابا جان کو بھی مشورہ دیا گیا کہ دورانِ تدریس یہ عبا پہنا کریں تو انہوں نے مجھے تاکید کی کہ ایسا عبا تلاش کرو جس کے کناروں پر سنہرا کام نہ ہو۔'' (ص ۳۳۴)

مولانا کو ٹیلی ویژن وغیرہ سے شدید نفرت تھی۔ ایک مقام پر ان کے بیٹے راغب حسن لکھتے ہیں:

''ٹیلی ویژن سے بھی سخت نفرت کرتے اور اپنی اولاد کو اس منحوس آلہ کے رکھنے سے منع کرتے۔ اگر آپ کو پتا چلتا کہ آپ کے کسی بیٹے، بیٹی یا دیگر متعلقین کے پاس یہ آلہ موجود ہے تو آپ یہاں تک کہہ دیتے کہ میں اسے عاق کر دوں گا۔'' (ص ۳۴۰)

اخبار میں عورتوں کی تصاویر پر مولانا کا ردّعمل، غضِّ بصر کے بارے میں سلف کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ان کی بھانجی اور بہو اُمّ یاسر لکھتی ہیں:

''ملکی حالات سے باخبر رہتے تھے، اخبار پہلے آپ ہی کے ہاتھوں میں جاتا تھا۔ رنگین صفحہ پر عورتوں کی تصاویر کو مار کر سے کالا کر دیتے تھے۔ اکثر تو وہ صفحات ہی پھاڑ کر پھینک دیتے تھے تاکہ دوسرے لوگوں کی نظریں نہ پڑیں۔'' (۳۹۴)

مولانا کی گھریلو اور نجی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں صبر کا پہلو بھی بہت غالب تھا۔ ان کے بیٹے حامد حسن لکھتے ہیں:

''انتہائی صابر اور شکر گزار طبیعت تھی، کبھی کوئی شکایت زبان پر نہ آتی۔ ایک دفعہ غسل خانے میں پھسل کر گر

پڑے' سر پر شدید چوٹ آئی' خون بہنے لگا' خاموشی سے آ کر بستر پر لیٹ گئے۔ اتفاق سے اسی وقت میں اور اہلیہ ان کے پاس پہنچے' وہ عجیب انداز میں لیٹے ہوئے تھے' ہم گھبرا گئے' دیکھا تو سر سے خون بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہا تھا۔ جلدی سے خون صاف کیا' بڑے بھائی ڈاکٹر ضیب حسن کو بلایا۔ انہوں نے دوائی لگائی' طاقت کا انجکشن دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ بستر سے اترتے ہوئے پھسل گئے' مسہری کی پٹی ان کی ریڑھ کی ہڈی سے ٹکرا گئی جس سے ہڈی میں کریک پڑ گیا۔ کافی دن تکلیف رہی' کہتے رہے کچھ زیادہ نہیں ہے' ٹھیک ہو جائے گی۔ بالآخر جب ہسپتال لے گئے اور ایکسرے کروایا تو پتا چلا کہ فریکچر ہے۔ یہ تکلیف بھی انہوں نے انتہائی صبر سے برداشت کی جبکہ آپ کی عمر تقریباً ۹۳ برس تھی۔'' (ص ۳۵۵۔۳۵۶)

کتاب کا تیسرا حصّہ

کتاب کے تیسرے حصے میں مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ سے مختلف مواقع پر لیے گئے انٹرویوز شائع کیے گئے ہیں۔ ان انٹرویوز میں بہت ہی قیمتی تاریخی اور علمی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ ان انٹرویوز میں مولانا نے متفرق معاصر مسائل میں سے اہم ایشوز پر اپنی معتدل علمی آراء کا اظہار بھی کیا ہے اور کسی رائے پر نقد کی صورت میں اس کا صحیح حل بھی تجویز فرمایا ہے۔

کتاب کے آخر میں ضمیمہ جات کے نام سے بھی ایک باب ترتیب دیا گیا ہے۔ اس باب میں مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کا شجرۂ علمی رسول اللہ ﷺ تک بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا کی خط و کتابت جو انہوں نے جماعت اسلامی کے رہنما میاں طفیل محمد صاحب اور معروف اہلِ حدیث عالمِ دین مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری سے کی ہے' اسے بھی شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ میں دو ایسی جامع صفات تھیں جن سے عموماً اہلِ علم طبقہ محروم ہے۔ ان میں سے ایک تو ان کی دین کے حرکی تصور کے ساتھ جذباتی و عملی وابستگی ہے اور دوسرا علمی' مذہبی اور مسلکی مسائل میں اعتدال کا پہلو تھامے رکھنا ہے۔ بلاشبہ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کا شمار ان بقیة السلف میں سے ہوتا ہے کہ جن کی رحلت کے بارے میں مقولہ معروف ہے: **موت العالِم موت العالَم۔**

کتاب کا ٹائٹل' کمپوزنگ' طباعت اور پیپر بھی انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے جس نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ تاریخ' تحریک' تعلیم اور تدریس سے تعلق رکھنے والے حضرات کے پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ کتاب محض ایک سرگزشت ہی نہیں بلکہ ایک قوم' ایک جماعت' ایک تحریک کے عروج و زوال کی داستان ہے جس میں اس زوال کے اسباب اور ان سے نکلنے کی راہیں بھی تجویز کی گئی ہیں۔ کتاب کا اکثر حصہ مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ کے صاحبزادوں میں سے ڈاکٹر صہیب حسن اور ڈاکٹر سہیل حسن نے مرتب کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبزادوں کو جزائے خیر عطا کرے کہ انہوں نے اس کتاب کو مرتب کر کے قوم کے ایک قیمتی سرمایہ کو محفوظ کیا ہے۔

(۲)

نام کتاب : تقریرِ ختمِ صحیح بخاری

مؤلف : مولانا محمد رمضان پھلپوٹو

صفحات: ۱۱۹، قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: مدرسہ عربیہ مظہر العلوم حمادیہ، کھوڑا، ضلع خیر پور میرس (سندھ)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مدنیہ، اردو بازار، لاہور (اور مکتبہ حمادیہ، جامعہ حمادیہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی

دینِ اسلام کے دو بنیادی مصادر ہیں: ایک کتاب اللہ اور دوسرا سنت رسول ﷺ۔ سُنّتِ رسول ﷺ پر مشتمل کتب میں صحیح بخاری کا مقام سب سے بلند ہے اور اسے قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب شمار کیا گیا ہے۔ مدارس اسلامیہ میں تعلیمی سال کے اختتام پر ختم بخاری کی تقریب کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ مدرسہ عربیہ مظہر العلوم کھوڑا، ضلع خیر پور میرس میں بھی ذی الحجہ ۲۰۰۹ء میں یہ تقریب خاص اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئی اور شیخ الحدیث مولانا محمد رمضان پھلپوٹو صاحب نے اس تقریب میں صحیح بخاری کی آخری روایت پر عالمانہ اور ناصحانہ درس دیا۔

مولانا رمضان صاحب کی اس تقریر کو کیسٹ سے صفحات پر اتار کر ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے حالات زندگی، شیوخ اور مقام و مرتبہ پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا رمضان صاحب نے اس تقریر میں سند کی اہمیت و ضرورت اور صحیح بخاری کی آخری روایت پر بھی سیر حاصل تحقیق پیش کی ہے۔

مجموعی اعتبار سے کتاب اپنے موضوع پر ایک عمدہ کاوش ہے۔ اگرچہ اس میں طباعت، اسلوبِ بیان اور زبان کی کچھ اغلاط موجود ہیں، مثلاً ص ۶۳ پر ایک جگہ لکھا ہے کہ ''عقل اس کو تسلیم نہیں کرتا'' جبکہ درست عبارت یوں ہے ''عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی'' یا اسی صفحہ پر ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ معتزلوں کا رد فرماتے تھے'' جبکہ ''معتزلوں'' کی جگہ ''معتزلہ'' کا لفظ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح صفحہ ۴۷ پر لکھا ہے ''پہلے جتنی بھی اُمتیں تھیں، انہیں سند نہیں تھی۔ حتیٰ کہ یہودیوں کو اپنی مقدس کتاب تورات کی، کوئی سند نہیں'' اس کی جگہ عبارت یوں ہونی چاہیے: ''پہلے جتنی بھی اُمتیں تھیں، انہیں سند حاصل نہیں تھی حتیٰ کہ یہودیوں کی مقدس کتاب تورات کی کوئی سند نہیں''۔ علاوہ ازیں عربی حوالہ جات کے لیے نوری نستعلیق، اردو زبان کا فونٹ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ عربی زبان کے اقتباسات اور حوالہ جات کے لیے عربی فونٹ ہی استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بعض مقامات پر ایک دعویٰ کے اثبات میں غلو کا پہلو بھی نظر آیا ہے۔ امید ہے مولانا رمضان صاحب اگلے ایڈیشن میں ان کی اصلاح فرمائیں گے۔

☆☆☆

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

#

Al-Baqarah

(Ayaat 260-286)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

(260) And when Ibrahim said: "My Lord! Show me how you give life to the dead." Allah said: "Don't you believe? Ibrahim said: "Why not! But in order to reassure my heart". Allah said: "So take four birds; then tame them to your call; then put on every mountain a cut-piece of them; then call them on, they will come to you quickly. And be sure that Allah is Mighty, Wise."

Prophet *Ibrahim* (AS) asked his Lord to show him how He will resurrect the dead in the Hereafter. As we mentioned in the previous *ayah*, the Prophets asked Allah (SWT) for these types of miracles, not because they did not believe in the resurrection, but to make their faith stronger by personal observation. *Ibrahim* (AS) took four birds as commanded by Allah (SWT), slaughtered them, mixed them together and placed those pieces on different hilltops. Then, when he called out to them, their blood and flesh flew to each other till they all came back to life by Allah's will and came flying to him at fast pace. After witnessing this miracle, it became crystal clear to *Ibrahim* (AS) that Allah does whatever He wills without any hindrance, because He is the All-Mighty, All-Wise.

Now we return to the subject of spending in Allah's cause, which began with *ayah* 245 of this *surah*, where Allah (SWT) has exhorted the believers to spend in His way if they really have faith in Him and the Last Day.

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾

(261) The example of those who spend their belongings in the way of Allah is like the example of a grain that sprouts into seven ears, each bearing one hundred

grains; and Allah gives manifold increase for whom He wills because Allah is the All-Embracing, Ever-Knowing.

In this *ayah*, Allah (SWT) gives an example of those believers who spend in His cause i.e. for Allah's *Deen*[72] that whatever they spend in the way of Allah (SWT) out of what He has provided them, will be returned to them multiplied by seven hundred folds in this world and the Hereafter. This *ayah* indicates that Allah (SWT) grows the good deeds of a believer just like He grows a plant for whoever sows it in a fertile land. And Allah (SWT) gives abundance to whomsoever He wills, as He is the Munificent and All-Knowing.

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٢٦٢

(262) Those who spend their belongings in the cause of Allah, then do not follow their charity with reminders of their generosity or injure the feeling of the recipient, for them is their reward with their Lord; no fear shall come upon them nor shall they grieve.

This *ayah* indicates that charity should be only for the sake of Allah (SWT) and the donor should neither expect a reward in this world in return, nor remind the recipient of the charity or cause any harm to him. He should refrain from any such acts or words, as even a mention of any favor may put the concerned person to shame or humiliation in the eyes of others. In sum, one should not follow one's spending with taunts and insults. Allah (SWT) promises such believers rewards in the Hereafter and guarantees that they will have no fear on the Day of Judgment and will not regret anything they would have done in the path of Allah (SWT).

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝٢٦٣

(263) Kind words and forgiveness are better than charity followed by injury. And Allah is Self-Sufficient, Ever Forbearing.

A person spends in Allah's cause for self-purification, but if it causes injury to the recipient, his charity becomes meaningless. Instead, Allah (SWT) exhorts His servants to be kind and gentle in their speech and forgive any shortcomings on the part of the beneficiaries. They should know that *"Allah is Self-Sufficient, Ever Forbearing"* i.e. He does not need their charities to give provision to His servants, because He is not in need of His creation; instead, all the creatures are in need of Him. So a kind word and forgiveness are better than charity followed by injury.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٦٤

(264) O you who believe! Do not make your charity worthless by reminders of your

generosity or by injury to the recipient's feelings, like the one who spends his belongings to show off before people and believes neither in Allah nor in the Last Day. So his example is like a hard barren rock covered by soil; then a heavy rain falls thereon leaving it just a bare stone. They are not capable to (gain) anything out of what they have earned. And Allah does not put on the right path the disbelieving folk.

Such is the behavior of a hypocrite who does not spend for the pleasure of Allah (SWT) but only for men to see, so that he can earn their pleasure and get worldly rewards from them. He neither expects any reward from Allah (SWT) nor believes in the Hereafter. *"So his example is like a hard barren rock covered by soil; then a heavy rain falls thereon leaving it just a bare stone. They are not capable to (gain) anything out of what they have earned. And Allah does not put on the right path the disbelieving folk."* Just as a heavy rain leaves a hard rock completely barren and bare, Allah (SWT) will completely erase the deeds of the hypocrites who give charity just to show off. Neither will Allah (SWT) guide them nor will they have any reward in the Hereafter. They shall gain nothing from their deeds.

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ
فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾

(265) And the example of those who spend their belongings to seek the pleasure of Allah and strengthen their souls, is like a garden on a hill whereon a heavy rain falls, thereupon it yields its produce twofold; or if the heavy rain does not fall, then a drizzle (is sufficient). And Allah is Watchful of whatever you do.

Allah (SWT) gives another parable for those believers who spend in His cause only to attain His pleasure and for the purification of their souls. The good deeds of a believer, performed with good intentions and devotion, never become barren just like a garden on a hill-side which is always fertile and even if there is no rain, a little moisture is sufficient for it i.e. a believer produces good works, gives charity and is satisfied with what Allah (SWT) has given him, even in lean times.

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ
الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾

(266) Does any of you wish that he should have a garden with date-palms and vines and streams flowing underneath and he has all kinds of fruit therein, and he is stricken with old age and has feeble offspring, then a whirlwind with fire therein strikes it (garden) and it gets burnt? Thus Allah makes His Ayaat clear to you so that you may ponder.

Allah (SWT) gives yet another parable in this *ayah* which explains the condition of a person who enters the life after death without any provision for it. Suppose a person plants a garden full of fruits, with streams gushing through, so that it would give him provision in his old age. How unfortunate then is he when his beautiful garden is reduced

to rubble towards the end of his days, just when he stands in greatest need of it and does not have the strength to build another one because of his old age. Similar will be the condition of a disbeliever on the Day of Judgment, who upon returning to Allah (SWT), will suddenly find out that all his earnings are left behind in the world. And there will be no chance for him to earn anything for the Hereafter; just like the old man who has lost his garden and his children are also unable to do anything because of their tender age. Thus Allah (SWT) makes plain to us His revelations, so that we may give thought.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۡ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

(267) O you who believe! Spend of the good things which you have earned and of that which We have brought forth for you out of the earth, and aim not at the bad to spend thereof, while you would not take it yourselves unless you close your eyes in (receiving) it. And keep it in mind that Allah is Self-sufficient, Praiseworthy.

In this important *ayah*, Allah (SWT) enjoins on the believers to spend from the pure and the best things in His way that they have earned honestly and lawfully and from the produce of the earth i.e. from the fruits and the vegetables grown from the land. And He (SWT) prohibits them to give for charity those worthless things which they do not even accept for themselves, as Allah (SWT) is independent of all wants and most worthy of all praise.

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(268) Satan threatens you with poverty and enjoins upon you indecency whereas Allah promises you forgiveness from His own and bounty. And Allah is All-Embracing, All-Knowing.

Satan holds the children of Adam (AS) from spending in the way of Allah (SWT) because of false fear of poverty and encourages indecency and immoral acts. On the other hand, Allah (SWT) calls them to the way of forgiveness and prosperity, instead of the evil towards which Satan prompts them. Allah (SWT) is the Munificent and All-Knowing.

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(269) He grants wisdom to whom He wills, and whoever is granted (real) wisdom, then of course he has been granted the abundant good but none observe the advice except men of intellect.

The Arabic word *'Hikmah'*, translated into wisdom, means the knowledge to differentiate between the truth and the falsehood. Anyone who has wisdom follows the path of Allah (SWT) and after fulfilling his basic needs from what he has earned, he spends whatever is left in the path of Allah (SWT) and does not follow the ways of Satan who tells him to gather more and more wealth instead of giving it in charities

for the pleasure of Allah (SWT). Yet, none except men of discernment bear this in mind.

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

(270) And whatever you spend in charity or whatever vow you undertake, of course Allah knows it. And for the unjust there would be no supporters.

Allah (SWT) knows the intentions and deeds of the believers such as charities and vows. So those who intend to give the charity or vow for Allah's cause, He will reward them for their deeds, but those who disobey His commands and worship others besides Him, will not find any help in the Hereafter to protect them from the punishment of Allah (SWT).

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

(271) If you disclose charities, it is good; but if you conceal them and give them to the poor, that would be better for you. And Allah will blot out from you some of your evil practices. And Allah is Aware of whatever you do.

This *ayah* indicates that it is lawful to give charity in open, especially when it is done to set an example for the people to follow suit. But Allah (SWT) says that it is better to conceal one's charity as it also saves him from showing off and boasting. And as a result, Allah (SWT), because of one's virtue and sincerity of performing good deeds secretly, promises to raise one's rank and forgive one's sins. He (SWT) has knowledge of all the deeds of His servants. So to give alms to the poor in private is better and will atone for some of one's sins.

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(272) (O Prophet!) It is not your responsibility to put them on the right path; instead it is Allah Who guides whom He pleases. And whatever you spend of good, it is to your own advantage, and you must not spend but to seek the pleasure of Allah. And whatever you spend of good, will be paid back to you in full, and you will not be wronged.

The Muslims generally disliked giving charities to their polytheist relatives and other disbelievers, but Allah (SWT) revealed this *ayah* and the believers were allowed to give them charity and were told that they were not responsible for the conversion of those people and that their responsibility was just to convey the truth to them in the best possible manner. *"And whatever you spend of good, it is to your own advantage, and you must not spend but to seek the pleasure of Allah. And whatever you spend of good, will be paid back to you in full, and you will not be wronged."* A person will be rewarded for his good intentions. If he gives charity only to attain the pleasure of Allah (SWT), it will be for his own benefit and it will be repaid to him in full on the Day of Judgment.

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

(273) (Spend) for those needy people who are restrained in Allah's cause and cannot move about in land (to earn their livelihood). The ignorant consider them to be well off due to restraint (from asking); but you can identify them by their appearance – they do not make insistent demands on people. And whatever you spend of good, of course Allah is thereby Aware.

This *ayah* refers to those people who have dedicated themselves wholly for Allah's *Deen*. Allah (SWT) commands His servants to give charity to such needy people who are unable to earn their livelihood. Such was the example of the Companions of the Prophet (SAW). They were trained for the service of Islam and sometimes had to travel long distances for the propagation of Allah's *Deen* and to engage in *Jihad* against the enemies of Islam. Thus they had to devote themselves wholly for Allah's cause and had no time to earn their livelihood. *"The ignorant consider them to be well off due to restraint (from asking)"* i.e. the ignorant people who do not know their situation think that they are well-off because they are modest in their clothes and speech, but the matter of fact is that they live from hand to mouth, as they have devoted themselves for the service of Islam and thus do not have any spare time to earn their livelihood. *"But you can identify them by their appearance—they do not make insistent demands on people"* i.e. these people do not importune men for alms and can be recognized by the light of contentment on their faces and by the tone of their speech. *"And whatever you spend of good, of course Allah is thereby Aware"* i.e. Allah (SWT) has full knowledge of the charities and alms you give and He will reward you accordingly on the Day of Judgment.

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

(274) Those who spend their belongings, night and day, secretly and openly, for them would be their reward with their Lord; no fear shall come upon them, nor shall they grieve.

Here Allah (SWT) promises great rewards for those of His servants who give charities in His way and seek His pleasure day and night. On the Day of Judgment, they will neither have fear of the punishment nor will they regret or grieve.

In the above section, we read about the moral excellence and rewards of charity i.e. selfless giving of one's wealth and property in the way of Allah (SWT). Now we come to its opposite i.e. *Riba* or *Usury*. On one hand, charity, when practiced in the true Islamic spirit i.e. only with the intention of attaining the pleasure of Allah (SWT), makes us genuinely concerned for the destitute and the needy and leaves no place for parade and vanity. But on the other hand, usury is the unlawful obtaining of wealth from a person in need or distress and is therefore forbidden in Islam.

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ
مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ
وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(275) Those who eat 'Riba' (usury, interest etc.) will not rise up but as stands the one whom Satan has driven to madness with the touch. That is because they say: "Trading is just like 'Riba' whereas Allah has made trading lawful and 'Riba' unlawful". So to whom the admonition has come from his Lord and thereupon he refrained, then he is entitled to what is earned in past and his matter rests with Allah, but whosoever reverts back, then such are the companions of the Hellfire and they will be therein 'eternal residents'.

Riba literally means growth or an addition. Technically, it is the additional amount, collected over and above the capital given as a loan. Dealing with usury or interest of any sort is strictly prohibited in Islam. One who indulges in usury by any means incurs upon himself the severest punishment from Allah (SWT). The beloved Prophet Muhammad (SAW) also warned the Muslims against receiving or giving usury and declared dealing with interest to be one of the most abominable sins in Islam. In this *ayah*, Allah (SWT) says that those who deal in usury will be resurrected from their graves as insane, because this is how they behaved in the world i.e. they pursued their lust for money as if they were insane. *That is because they say: "Trading is just like 'Riba' whereas Allah has made trading lawful and 'Riba' unlawful".* The unbelievers would raise a question as to why interest or usury was prohibited when profit from capital in trade was lawful. But Allah (SWT) says that He has made trade lawful and dealing in usury or interest as unlawful for His servants. *So to whom the admonition has come from his Lord and thereupon he refrained, then he is entitled to what is earned in past and his matter rests with Allah, but whosoever reverts back, then such are the companions of the Hellfire and they will be therein 'eternal residents'* i.e. whoever used to indulge in usury and repents now, Allah (SWT) will forgive his past sins, but those who even after gaining knowledge that usury is unlawful, persist with it, will be amongst the losers on the Day of Judgment and their final abode will be the Hellfire, wherein they will live forever.

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝

(276) Allah eradicates 'Riba' and flourishes charities. And Allah (SWT) does not like any sinful disbeliever.

This means that Allah (SWT) deprives the money or property earned by usury of all blessings, because it is based on greed and selfishness. On the other hand, Allah (SWT) makes the charity grow and increases it, as it is based on sympathy, generosity and compassion. *"And Allah does not like any sinful disbeliever"* i.e. those who try to attain others' wealth by illegal means, will be deprived of Allah's love. He (SWT) bears no love for the ungrateful sinners.

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

(277) Verily those who believe, do good deeds, establish prayers, and give obligatory charity will have their reward with their Lord; and no fear shall come upon them nor shall they grieve.

In this *ayah*, Allah (SWT) praises those who worship Him alone and observe His rights and that of His creatures. They are the ones who establish *Salah*, give *Zakah* and spend from their wealth on doing good deeds in the way of Allah (SWT). Allah (SWT) guarantees the salvation of such believers in the Hereafter. They will be rewarded by their Lord and will have nothing to fear or grieve.

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾

(278) O you who believe! Fear Allah and give up what remains of 'Riba' if you are true believers.

Allah (SWT) strictly warns His servants to waive what is due to be paid as *Riba* by others and to stop dealing in it if their faith is true and sincere.

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾

(279) But if you do not do so, then take notice of war from Allah and His messenger. And if you repent, then to you belongs the principal amount; neither deal unjustly nor be dealt with unjustly.

This verse is an ultimatum by Allah (SWT) to those who indulge in *Riba*. He (SWT) warns them not to take anything other than their original capital without any addition or decrease in it, or be sure of a war declared by Allah (SWT) and His Messenger (SAW) against them. In case they repent, they may retain their principal, neither wronging anyone (with an increase) nor being wronged (by suffering a loss).

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾

(280) And if (the debtor) is in some difficulty, then grant him time till it is easy (for him to repay), and that you waive as charity would be far better for you, if you really know.

Allah (SWT) enjoins on the believers to give more time to the debtors for the payment of the debts, if they are finding it difficult to pay it back. However, if the creditors waive the debt as alms, it is better for them i.e. they will be rewarded by Allah (SWT) in this world and in the Hereafter as narrated by *Abu Qatadah* (RA) that the Messenger of Allah (SAW) said: *"Whoever gives time to his debtor, or forgives the debt, will be in the shade of the throne (of Allah (SWT)) on the Day of Resurrection."* [73]

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

(281) And fear the Day wherein you shall be returned to Allah, then every soul

shall be paid in full what it has earned and they will not be dealt with unjustly.

Those who refrain from evil and greed and do good will be rewarded by Allah (SWT) for their good deeds on the Day of Judgment. But those who wrong others and fleece them will be punished and will suffer a great torment on that day when every soul shall be requited according to its deserts and none shall be wronged.

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌ ۢ بِالۡعَدۡلِ وَلَا يَاۡبَ
كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبۡ ۚ وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ فَاِنۡ
كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ وَاسۡتَشۡهِدُوۡا
شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا
فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ
ذٰ لِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰۤى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ
فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۚ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ
فُسُوۡقٌ ۢ بِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۲﴾

(282) O you who believe! When you contract a debt for a fixed period of time, write it down. And a scribe should write down between you justly, and no scribe should refuse to write as Allah has taught him, so he must write. And the one who incurs the liability should dictate and he should fear Allah—his Lord, and should not diminish therefrom anything. But if the debtor is mentally deficient or feeble or is unable to dictate himself, then his guardian should dictate justly. And call to witness two witnesses out of your men, but if two men are not available then one man and two women whereupon you mutually agree out of the witnesses, so that if one of the two women errs then the other can remind her. And the witnesses must not refuse whenever they are summoned (to give evidence). And you should not be weary to write it (your contract) for a future period whether it be small or large; that is more just in the sight of Allah and more establishing for the evidence and more likely to prevent you from ambiguity; except that it be on spot trade that you transact among yourselves. In that case there is no sin on you if you don't write it down. And call to witness when you trade with one another. And neither a scribe be made to suffer nor a witness, but if you do so, then indeed it would be a sin on your part. And fear Allah. And Allah teaches you. And Allah is Aware of everything.

Allah (SWT) commands the believers to write down all the transactions involving future payments so that there may be no chance of any dispute between the two parties. Every contract of debt should be written down by a scribe with fairness and he should not refuse to write the contract; instead, he should be grateful to Allah (SWT) for the art of writing He has given to him and should use it for His service. *"And the one who incurs the liability should dictate and he should fear Allah—his Lord, and should not diminish therefrom anything. But if the*

debtor is mentally deficient or feeble or is unable to dictate himself, then his guardian should dictate justly" i.e. the debtor should dictate the scribe the money he owes and should not hide anything of what he owes to the creditor. But if he is unable to dictate it because of an illness or disability, it is allowed for him to appoint a guardian who should dictate on his behalf. Further Allah (SWT) has commanded the Muslims to appoint witnesses from among them who are honest, when dictating a debt or contract as He says: *"And call to witness two witnesses out of your men, but if two men are not available then one man and two women whereupon you mutually agree out of the witnesses, so that if one of the two women errs then the other can remind her"* i.e. two women take the place of a man when witnessing financial transactions because of the likely mental shortcoming in the form of forgetfulness. *"And the witnesses must not refuse whenever they are summoned (to give evidence)"* i.e. once a person is made a witness in a transaction, he should not refuse to testify it when needed. *"And you should not be weary to write it (your contract) for a future period whether it be small or large; that is more just in the sight of Allah and more establishing for the evidence and more likely to prevent you from ambiguity."* One should not feel ashamed to write down the contract with the date of payment even if it is for a very insignificant amount, as it is convenient for both the parties and also helps repel any doubts in the future. *"Except that it be on spot trade that you transact among yourselves. In that case there is no sin on you if you don't write it down. And call to witness when you trade with one another."* Transaction carried out on the spot in everyday businesses like cash payment or delivery does not require a person to write them down but it is better if they do record them. *"And neither a scribe be made to suffer nor a witness, but if you do so, then indeed it would be a sin on your part."* The scribe and the witness should neither be forced nor should suffer any harm because of their testifying against the interests of any party. *"And fear Allah. And Allah teaches you"* i.e. He has given you the intellect to judge between right and wrong.

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۭ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۭ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸۳

(283) And if you are on a journey and cannot find a scribe, (resort to) pledge taken in possession. So if one of you deposits something as trust to the other, then the one who is entrusted must discharge his trust and he should fear Allah – his Lord. And do not conceal the testimony, and whosoever conceals it, then of course his heart would be sinful. And Allah knows whatever you do.

This *ayah* indicates that it is allowed for the creditor on behalf of the debtor, to hold a pledge as a security for the repayment of the debt whether on a journey or not. However, if both the parties trust each other, there is no harm if they do not write down the transaction or have witnesses present, but they should fear Allah (SWT) and should not betray each other and the trustee should restore the pledge to its owner.

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴

(284) To Allah belongs all that is in the heavens and on earth. And whether you disclose what is in your hearts or conceal it, Allah will call you to account for it; so He will forgive whom He wills and will punish whom He wills. And Allah is Powerful over everything.

Allah (SWT) is the Master of all that is in the heavens and the earth and all that is between them. He (SWT) even knows those intentions and thoughts that a person conceals in his heart and consequently will hold people accountable for whatever is in their hearts. This *ayah* was abrogated when Allah (SWT) revealed the following *ayah*: *"Allah does not burden any human being with more than he can bear..."*[74] Further Allah (SWT) says: *"He will forgive whom He wills and will punish whom He wills. And Allah is Powerful over everything"* i.e. He is the sole Sovereign and has total authority to punish anyone or forgive anyone He wills.

Now we come to the last two *ayaat* of this blessed *surah*. These *ayaat* were revealed when Prophet Muhammad (SAW) went on the *Isra* journey. There are many excellent points with regard to the two *ayaat* mentioned in the *Ahaadith* of Prophet Muhammad (SAW). It has been narrated by *Abu Masud* (RAA) that the Messenger of Allah (SAW) said: *"Whoever recites the last two ayaat in surah Al-Baqarah at night, they will suffice him."* [75] Allah (SWT) taught the Muslims to recite this prayer at a time when they were being persecuted and tortured and there was no place for them to live in peace.

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۲۸۵

(285) The Messenger has believed in what has been sent down to him from his Lord, and (so did) the believers; everyone believes in Allah, His angels, His Books and His Messengers. (They say) we do not differentiate between any of His messengers and they say: "We have listened and obeyed; (we ask) Your forgiveness; O' our Lord! And unto You would be the ultimate return."

i.e. the Messenger (SAW) and his followers believe in whatever has been revealed from Allah (SWT). They believe in the oneness of Allah (SWT) and that He is the only Sustainer. The believers also believe in all His Messengers (AS) and do not differentiate between any of them or reject any one of them. They also believe in His angels and all the Books that He (SWT) has revealed to His Messengers. The believers also ask for Allah's help and guidance, humbly pray to Him for the forgiveness of their sins and firmly believe in the accountability to Him on the Day of Judgment.

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ

لَنَا ۚ وَارْحَمْنَا ۚ أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨٦﴾

(286) Allah does not burden any soul beyond its capacity; for it would be what it has earned and against it what it has earned. Our Lord! Do not hold us accountable if we forget or fall into error. Our Lord! And do not put upon us the burden as you put upon those before us. Our Lord! And do not make us carry the burden for which we do not have capacity. And Pardon us, grant us forgiveness, have mercy on us; You are our Protector; so give us victory over the disbelieving folk.

Firstly, Allah (SWT) does not charge a person with what is more than he can bear. Secondly, A person will be rewarded or punished only for the acts he is responsible for and not for those in which he has had no share—neither by intent nor by actual action. In other words, each self shall be requited for whatever good and whatever evil it has done. *"Our Lord! Do not hold us accountable if we forget or fall into error"* i.e. if we do commit an unintentional error or lapse into error. *"Our Lord! And do not put upon us the burden as you put upon those before us"* i.e. save us and protect us from the trials and tribulations our predecessors were tested with. *"Our Lord! And do not make us carry the burden for which we do not have capacity"* i.e. do not test us with trials and tribulations that we cannot bear and subject us to only those trials that we can endure. *"And Pardon us, grant us forgiveness, have mercy on us; You are our Protector; so give us victory over the disbelieving folk"* i.e. pardon us, forgive our sins and our errors, have mercy upon us and help us and protect us against those who reject and mock at Your religion and impugn Your Oneness.

Endnotes

[72] Refer to the explanation of ayah 245 of this surah.

[73] Musnad Ahmed 5: 308.

[74] Surah Al-Baqarah (2): 286. (The abrogation is recorded in Sahih Muslim 1: 115.)

[75] Fath-ul-Bari 8: 672

A TWO-PRONGED STRATEGY FOR

THE ESTABLISHMENT OF KHILAFAH

Sumaira Khalid

The establishment of Khilafah is the dream of every conscientious Muslim who understands its concept, its purpose and benefit. Above all, it is the Divine imperative which drives a Muslim to dream and struggle for its establishment. This drive cannot materialize into solid effort and preparation unless the heart is enlightened with the rationale behind it.

Khilafah is a rule established by the Muslims on the foundations of Islam and Iman, leading to *Ihsan*. It is the hegemony of Muslims over land and people to precipitate moral, spiritual, intellectual and social development **with the twin qualities of justice and equality**. The concept of Khilafah is an interlaced pattern of existence for the human kind, with rules and regulations, with limitations which liberate rather than confine. It is a "wholistic concept of existence" encompassing every aspect of life, be it political, personal, economic, military, social, intellectual or religious. It is a concept which is superior to every other concept of existence because it is a Divine concept, given by the Creator, the Sovereign. Man-made concepts of existence can never be wholistic and meritorious for man's vision is limited and his judgement fallible. No one else deserves the right and knowledge to pass judgement about the way of existence for human beings on this earth other than Allah, who knows His creation. The ineligibility of human kind to create a wholistic world view for peaceful existence is proved by their blind acceptance of the hollow philosophy of "secularism" --- a rejection of all dogma and practice and acceptance of none; a fragmented existence without purpose. Secularism frees itself from all Divine laws --- for instance, a freedom from the law and institution of marriage --- thereby making legitimate any way of existence. Hence, secularism is characterized by a stripping off of all restrictions and limitations, thereby advocating an unrestrained, purposeless life.

The call for the establishment of the Khilafah has to be the call of every true *Dae`e* of Islam --- one cannot escape this mission. Dr. Israr Ahmad dedicated his life to serve the mankind by calling them to establish the Khilafah. Having understood the meaning and purpose of life, he wanted the rest of humanity to be guided to the truth. He believed that the establishment of the

Khilafah was impertinent because without it Islam would never be implemented as it ought to be and would exist only as a religion like other religions. While addressing a congregation in the Quran Auditorium on December 25th, 1994 he said, "Islam is a Deen --- a complete code of life --- whose very nature demands that it be made dominant as a socio-political reality."[1] Islam recognizes that human beings share the same planet and live as tribes and societies, therefore, it prescribes laws for a collectivity and can only properly work when implemented by a collectivity. Its true benefits cannot be achieved if it does not acquire social and political patronage. The movement of Abdul Wahhab gained fame in Arabia and its fruit is there to stay because it got political support from the Sauds. Islamic Shariah cannot be implemented unless it is politically supported. The Government of France has announced that the ban on the use of veil is being enforced from 11th April 2011,[2] while Tennessee is contemplating over passing a bill which advocates jailing those who support and implement the Shariah[3]! These moves may be prevented by protest or debate but the benefit of their prevention will not be long lasting. Another anti-Islamic issue will prop up as long as Islam is practiced, while the Muslims will remain helpless. Thus, there is no other way out of the perpetual conflict between the West and Islam except to struggle for the establishment of Khilafah.

In his booklet "Islamic Renaissance: The Real Task Ahead", Dr. Israr refers to the Islamic Renaissance as another name for Khilafah, calling it "the establishment of government and public order according to the will of Allah" and the "enforcement of the Islamic system of life". For this, he suggests a blueprint for action which lays stress on the dissemination of Quranic teachings and the establishment of a Quran Academy. *Alhamd-o-Lillah*, the Quran Academy exists today and so do a number of individuals who engage themselves in learning and teaching the Quran. But this alone does not suffice.

Dr. Israr adds, "If it were possible to make Islam dominant simply by educating and reforming people, I assure that Prophet Muhammad ﷺ would not have allowed the blood of even a *kafir* to spill, let alone the blood of his beloved Companions j."[4] He further writes that, "The first step of any socio-political revolution is to call people towards the new ideology and to organize them into a disciplined *Jamah*, and this *Jamah* must then struggle as a unit in order that falsehood can be defeated and truth is made supreme."[5]

From these views, we can derive that the establishment of the Khilafah has two demands from us. What needs to be followed is a two-pronged strategy which involves:

a) An intellectual engagement/assault (Dawah)

b) An armed military/physical engagement (Jihad)

Dr. Israr wanted the intellectually active agents to precipitate the desired goal by learning and acquiring contemporary knowledge. He specially advocated the learning of the Arabic language which is a part of the miracle of the Quran. The intellectual onslaught requires calling the Muslims to revive their faith and confronting the secular west. Dr. Israr contends that once these intellectual products are prepared and active, the second aspect of the strategy will have to be faced, but in the present scenario, I find it hard to agree with the sequence. Rather than being linear, the process should be simultaneous. According to the bulk of Ahadiths on the appearance of the Mehdi, the coming of Dajjal and Prophet Esa ں, one cannot ignore the role of Jihad/Qitaal in the foremath of the establishment of global Khilafah. Even now, Muslim soil in Afghanistan, the frontier parts of Pakistan, Iraq, Palestine and Kashmir are in a state of war. This is the ground reality which cannot be denied. The question arises: Should the Muslim Ummah be indulging in dialogues when there is bloodshed and active aggressive attempt against it? Does Islam not exhort us to take the defensive in such situations? Deterrence through dialogue or any other way takes place to avoid the possibility of war. It may be of no use when an armed assault has already taken place and is continuously taking place. In such a situation, the Muslims are directed to take the defensive, like they did at the time of the Battle of Badar. Hence, the only end to the current hostility faced by the Muslims will be a united armed struggle and confrontation.

Does this, then, mean that all attempts to indulge in intellectual activism for the sake of Islam are going to be fruitless? Are they not the need of the time? Should they be shunned, abandoned and left for none to be done? Certainly not! They are definitely required to change the present dormant state of the Muslims, to wake up the sleeping majority. But it is not intellectual activism alone that will make us achieve our goal. Intellectual activism is just one of the means to an end.

Simultaneously, training for Jihad should be must for Muslims. The Afghan-Taliban succeeded in creating the Islamic Emirate of Afghanistan because military training was a part of their day-to-day life. The case of Pakistani Muslims is different. They are a product of the luxury-loving Mughal and the materialistic, colonial British. We have learnt to be over-occupied with the aesthetic aspects of life, living in elaborate brick houses and boasting of them. Possessing the worst traits of both the reigns, what is the possibility for men and women living in such conditions to even think of Jihad? Dr. Israr too advocated the strengthening of our defence force and acquisition of weaponry and armament along with expanding and safeguarding our nuclear program[6]. Today, even the defence force cannot be trusted for it works as an ally for the U.S.

Today, the intellectual elite contend that the war between Islam and the West exists more at the intellectual plain and is meant to be tackled there. It's not the time to fight, they say. But who can deny the drone attacks? Can it, then,

be said that the effort of the true mujahideen fighting in Afghanistan, Palestine and else where are pointless? The enemy would have created more trouble in these lands if it wasn't for these so-called "terrorists".

The point being made here is that the Muslims should review the present situation of the Ummah and subject themselves to moral questions about their responsibility, about their role in establishing the Khilafah. It is this awakening of the Muslims which a true Dae`e aims for.

Khilafah is not established but we have solace in many Ahadiths of the Prophet Muhammad ﷺ that one day it will. There will be time when the munafiqeen and the momineen will clearly stand out. Are we ready for the reign of the **Khilafah** we are so earnestly waiting for?

Endnotes:

[1] Dr. Israr Ahmad, The Call of Tanzeem-e-Islami. Markazi Anjuman Khuddam-ul-Quran Lahore, 2006. p. 11

[2] CNN http://edition.cnn.com/2011/WORID/europe/03/04/france.burqa.ban/, March 4, 2011. Retrieved on March 6, 2011.

[3] www.tanzeem.org/article/20110223/NEWS0201/102230378/Tanessee-bill-would-jail-shariah-followers-; Feb 23, 2011. Retrieved on March 6, 2011.

[4] The Call of Tanzeem-e-Islami; p.34-5

[5] Ibid; p. 35

[6] Dr. Israr Ahmad; Khilafah in Pakistan: What, Why and How? p. 8